سازِ مغرب

حصہ ششم

مرتبہ: حسن الدین احمد

ولا اکیڈمی

حیدرآباد (آندھرا)

سازِ مغرب

اُردو آہنگ میں

حِصّہ ششم

مُرتّبہ

حسن الدین احمد

ولا اکیڈمی حیدرآباد

سلسلۂ مطبوعات وِلاؔ اکیڈمی (۳۷)

زمانہ اشاعت　نومبر ۱۹۷۸ء

تعدادِ اشاعت　ایک ہزار

کِتابت　محمدؐ عارف الدین و
عبدالصّبور خاں (دہلی)

طباعت　کوہِ نور پریس، چھتہ بازار

قیمت　بیس روپے

ناشر

وِلا اکیڈمی

مِلنے کا پتہ

وِلاؔ اکیڈمی ـ عزیز باغ، سلطان پورہ، حیدر آباد
۵۰۰۰۲۴

ترتیب

ابتدائی باتیں

منظوم ترجموں کے انتخاب کے سلسلے میں ساز مغرب کا چھٹا حصہ وِلا اکیڈمی کے سلسلۂ مطبوعات کی سینتیسویں (۳۷) کڑی کی حیثیت سے اہلِ ذوق کی خدمت میں پیش ہے۔ اس مرتبہ (۷۷) اُردو شاعروں کے (۱۱۴) منظوم ترجمے شریکِ اشاعت ہیں، جن میں (۲۱) منظوم ترجمے سابق حصوں میں پیش کی گئی نظموں کے ہم ترجمے ہیں۔

اس مرتبہ ساز مغرب کے چھ حصوں میں شریک کیے گئے، (۵۸۶) منظوم ترجموں کا ایک انڈکس شاملِ اشاعت ہیں۔ انگریزی سے کیے گئے منظوم ترجموں کی یہ اوّلین مبسوط فہرست ہے اور اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے۔

جن حضرات نے منظوم ترجموں کی فراہمی میں مدد فرمائی ان سب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس مرتبہ ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل

کرتے ہوئے نواب سر نظامت جنگ کی انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے جو جناب مصطفےٰ حسین آصفی کی کاوش کا نتیجہ ہیں شامل کیے جا رہے ہیں۔ جناب نظیر حسین فاروقی کا کیا ہوا ایک منظوم ترجمہ "حمد" بھی شامل ہے۔ ان منظوم ترجموں کی فراہمی جناب ظہیر احمد صاحب کی نشاندھی کی وجہ سے ممکن ہو سکی، جس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

اس حصہ میں شامل نظموں کا ایک بڑا حصہ جناب محمد عبد الصمد کے شخصی تعاون کا رہین منت ہے۔ اس کے لئے میں موصوف کا شکر گزار ہوں۔ ان کی اردو دوستی اردو ادب سے دلچسپی اور اردو رسائل پر ان کی نظر ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے۔

حسن الدین احمد

عزیز باغ
سلطان پورہ، حیدر آباد
دسمبر ۱۹۷۸ء

حسب ذیل منظوم ترجموں کی اصل انگریزی نظمیں

حصّہ اول میں موجود ہیں

حسب ذیل منظوم ترجموں کی اصل انگریزی نظمیں

حصّہ سوم میں موجود ہیں

حسب ذیل منظوم ترجموں کی اصل انگریزی نظمیں

حصّہ چہارم میں موجود ہیں

سید سراج الدین علی خاں

نرگسِ زرّیں نگار

مثلِ بادل گھومتا پھرتا تھا میں بیگانہ وار
وادیوں کے دوش پر سوئے فرازِ کوہسار
یک بہ یک میری نظر جب اُٹھ گئی بے اختیار
دیکھتا کیا ہوں ہجومِ نرگسِ زرّیں نگار
جھیل کے دامن میں پیڑوں کے تلے کھلتے ہوئے
نرم جھونکوں سے صبا کے جھومتے ہلتے ہوئے

اک مسلسل روشنی جیسے ستاروں کی ضیا
جھلملا کر دھند ہالہ سا بنائے نُور کا
کچھ اُسی انداز سے پھیلے ہوئے بے انتہا
دامنِ ساحل پہ خیزاں سلسلہ در سلسلہ
مختصر سی اک جھلک میں دیکھتا ہوں بے شمار
لہلہاتے سرخوشی میں ناچتے مستانہ وار

ان کے پہلو میں بھی لہراتی ہے گرچہ موجِ آب
پست کر دیتی ہے اس کو ان کی موج آب و تاب
اور کیا ہو ایک شاعر کی مسرّت کا نصاب
اس نشاط انگیز صحبت سے فزوں تر انتخاب
غرقِ نظارہ رہا جانچا نہ غور و فکر سے
کیا متاعِ بے بہا منظر نے بخشا ہے مجھے

تخت پر آسودگی سے لیٹتا ہوں جب کبھی
ہو مخلع طبع یا کچھ سوچ ہو آئی ہوئی
کوند جاتے ہیں وہ اُس چشمِ تخیّل پر مری
فرحت افزا جس کی ضَو سے تیرہ تنہائی ہوئی
دیکھتے ہی دل مرا مسرور و شاداں ہو گیا
اور بسنتی نرگسوں کے ساتھ رقصاں ہو گیا

ہم ترجمے "سازِ مغرب" حصہ اول صفحہ ۶۲ و ۶۳ اور حصہ سوم صفحہ ۱۱۴ پر دیکھئے۔

جعفر حسینی جعفر

گلِ نرگس

میں مثلِ ابرِ نیساں محوِ سیرِ کوہساراں تھا
فضا میں وادیوں کی لطفِ گل گشتِ بہاراں تھا
سمندر اک گلِ نرگس کا موجیں مارتا دیکھا
نسیمِ صبح میں پھولوں کا رقصِ جانفزا دیکھا

فضاؤں میں ہواؤں کی مسرت باریاں دیکھیں
کنارے جھیل کے قدرت کی صنعت کاریاں دیکھیں
قطار اندر قطار استادہ لاکھوں پھول نرگس کے
مسلسل دُور تک لا انتہا پھیلے ہوئے دیکھے

سنہرے پھول نرگس کے ہزاروں لہلہاتے ہیں
فلک پر کہکشاں میں جیسے تارے جگمگاتے ہیں

ادھر پانیِ خوشی کے سرمدی دریا بہاتا ہے
مگر گلزارِ نرگس اور ہی کچھ گل کھلاتا ہے
کہاں پانی کہاں نرگس کی آب و تاب لاثانی
کہ جس کو دیکھ کر تھا پانی پانی جھیل کا پانی

ہر اک ذرّہ جہاں کا عالم حیرت میں ساکن تھا
نہ ہو بیتاب شاعر تابِ گل سے کب یہ ممکن تھا

میں محوِ دیدِ گل تھا اور نہ تھی مجھ کو خبر اتنی
کہ یہ منظر مجھے بخشے گا اک دولت مسرت کی

بعزمِ استراحت جب کبھی بستر پہ جاتا ہوں
دلِ راحت طلب کو وقفِ صد افکار پاتا ہوں

کبھی خالی کبھی احساسِ غم سے نالہ فرسا ہے
تماشا ہے دلِ ناداں، دلِ ناداں تماشا ہے

تو ایسے میں اچانک وادیٔ گلزار کا منظر
چمک اٹھتا ہے مثلِ برق میری چشمِ باطن پر

مسرّت کا خزانہ تحفۂ خلوت جسے کہیے
وہ میری چشمِ باطن چشمۂ جنّت جسے کہیے

مرادوں کی نکل آئی ہے صورت نامرادی میں
خوشی کا ایک ساگر بہہ رہا ہے دل کی وادی میں

دلِ دیوانہ دارم با گلِ گلزار سی رقصم
بیادِ نرگسِ شہلائے آں دلدار می رقصم

"آج کل" مارچ سنہ ۱۹۶۰ء

ہم ترجمے "سازِ مغرب" حصہ اول صـ ۶۲ و صـ ۶۳ اور حصہ سوم صفحہ ۱۱۴ پر دیکھئے۔

شادؔ عارفی

تارے

اے آکاش پہ رہنے والو | دھیمے دھیمے بہنے والو
کاہکشاں میں بسنے والو | مجبوروں پر ہنسنے والو
دُور پار ہے دیس تمہارا | تم سے جھلمل عالم سارا
آپس میں آنکھیں مت مارو | مجھے دکھی کہہ کر نہ پکارو
تم کیا ہو؟ یہ کوئی نہ جانے | انجان، جانے پہچانے
پھر بھی میں اور تم سے باتیں | تم سے جگمگ تیری راتیں
کتنے ہو، گنتا رہتا ہوں | جی لگتا ہے۔ سچ کہتا ہوں
شاعر کے جذبے بکھرے ہیں | مطرب کے نغمے نکھرے ہیں
اُس کی افشاں چھوٹ پڑی ہے | حُور کی مالا ٹوٹ پڑی ہے
چھوٹے تارو اچھے تارو | میرے دل پر تیر نہ مارو
کوئی میٹھا راگ سُناؤ | بے کھٹکے بے لاگ سناؤ
ٹوٹے دل کی بات بنالو | کوئی ایسی راہ نکالو

ہاتھ آجائے پریم کنارا
جاگ اُٹھے قسمت کا تارا

"ہمایوں"، اکتوبر ۱۹۴۱ء

ہم ترجمہ، سازِ مغرب، حصہ چہارم، صفحات ۴۹، ۵۱ پر دیکھیے۔

حافظ محمد یعقوب اوجؔ

چھوٹے تارے

اے چمکیلے چھوٹے تارو !
چرخِ بریں کے اے سیارو !
دلکش منظر ہے وہ تمہارا
کیسا سین ہے پیارا پیارا
چم چم چم چم کرتے ہو شب بھر
نیلے سطح چرخِ بریں پر
جلوۂ قدرت تم سے عیاں ہے
تم سے روشن باغِ جہاں ہے
چرخ پہ تم رہتے ہو ہویدا
جیسے ہو آکاش پہ ہیرا
دیکھ کے روشن تم کو یہ شب بھر
جگنو سمجھا بچوں نے اکثر

ہوتا ہے خورشید نہاں جب
ظلمتِ شب ہوتی ہے عیاں جب
تاریکی میں بسنے والے
روشنی پاتے رہتے ہیں تم سے

چرخِ بریں پر تم جو نہ ہوتے　　راہ رووں کو ملتے نہ رستے
یوں ہی بھٹکتے چلتے شب بھر　　مارے پھرتے یوں ہی در در

کیا دلکش ہے تمہارا منظر　　روح فزا ہے پیارا منظر
میں بھی تمہارے حُسن کا جلوا　　دیکھتا رہتا ہوں بیٹھا بیٹھا
چرخِ بریں پر مہرِ درخشاں　　ہوتا نہیں جب تک ہے نمایاں
رہتے ہو روشن بامِ فلک پر　　شام سے لے تا صبح برابر
والہ وشیدا اوج تمہارا
تم کو یدِ قدرت نے سنوارا

"ادیب" مارچ سنہ ۱۹۱۳ء

سید سراج الدین علی خاں

فلسفۂ عشق

آب جوؤں کی روانی سوئے دریا ہے تمام
سینۂ بحر میں دریاوں نے پایا ہے مقام
ورطۂ چرخ کی مخلوط فضاؤں سے مدام
ہے جو محکم یہ خوش آہنگ فضاؤں کا نظام

کوئی شئے عالم امکاں میں مجرّد ہو محال
بہ تقاضائے مشیّت یہی دستور ہے عام
ظرفِ اجسام و عناصر رہے پابند وصال
حیف تنہا رہوں میں وصل سے تیرے ناکام؟

دیکھ پربت کی چٹانوں کا فلک بوس اُبھار
اور اُبھرتی ہوئی لہروں کا بغل گیر فشار
کوئی منہ بند شگوفہ نہ کھلے گا زنہار
اپنے ہم جنس کا تحقیر سے ٹھکرائے جو پیار

تارِ خورشید نے لپٹا لیا آفاق کا دل
ماہ کی جوت سمندر سے کرے بوس و کنار
اُنس و الفت کے ان اسباق سے آخر حاصل
تو اگر مجھ کو نہ چاہے نہ کرے مجھ کو جو پیار

ہم ترجمے "سازِ مغرب" حصۂ اول صفحہ ۱۹۳، حصہ دوم صفحہ ۸، ۷، ۹۱، حصہ سوم صفحہ ۹۶
حصۂ چہارم صفحہ ۶۳ ۔

ارشد تھانوی

فلسفۂ اتحاد

چاند کی کرنیں سمندر میں گرا کرتی ہیں
جوشِ اُلفت میں اُسے چوم لیا کرتی ہیں
جلوہ گر شرق سے ہوتا ہے جو مہرِ انور
روشنی اس کی پلٹتی ہے زمیں سے آ کر

ابر سے پانی برستا ہے جو قطرہ قطرہ
افتراق اُس کا بھی مٹ جاتا ہے رفتہ رفتہ
چشمے بہ بہ کے ہوا کرتے ہیں ضم دریا میں
موجیں ہوتی ہیں بغل گیر بہم دریا میں

پھُول گلشن میں جو کھلتے ہیں الگ شاخوں پہ
جھوما کرتے ہیں سحر کو وہ گلے مل مل کر
روز پروان جو یہ چڑھتا چلا جاتا ہے
سرو سورج کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے

کچھ ہوا ایسی چمن کی ہے دلِ بلبل میں
خوفِ صیّاد نہیں شوقِ بقائے گُل میں
گرمیِ حسن سے گو اس کے جلے جاتے ہیں
پھر بھی پروانے سوئے شمع چلے آتے ہیں

مختلف سمتوں سے چلتی ہیں ہوائیں جتنی
شوق میں آکے وہ آپس میں ہیں ملتی جلتی
ناز کرتے ہیں پہاڑ اپنی فلک بوسی پر
آسماں کرتا ہے اظہار نوازش جھک کر

گھاس کی پتیاں ہیں کاہ ربا سے چمٹی
لوہے کو کھینچتی ہے قوتِ مقناطیسی
برق گرتی ہے جو پانی میں تو رہ جاتی ہے
پھر پلٹ کر کبھی اس میں سے نہیں آتی ہے

ہستیاں یونہی ہوا کرتی ہیں باہم یک ذات
اپنے مطلب سے مل جاتی ہیں کل مخلوقات
ایک سے دوسرا ملتا رہے فطرت ہے یہی
کشش و جذب کی دنیا میں حقیقت ہے یہی

ہائے پھر آپ کا یوں مجھ سے جُدا ہو جانا
میری تقدیر کا ہے مجھ سے خفا ہو جانا

ماہنامہ الناظر، یکم جولائی سنہ ۱۹۱۱ء

ہم ترجمے : ساز مغرب، حصہ اول صفحہ ۱۹۲ حصہ دوم صفحات ۷۸، ۷۹۔
حصہ سوم صفحہ ۹۶، حصہ چہارم صفحات ۶۳، ۲۵۱، حصہ پنجم صفحہ ۱۷ پر دیکھئے۔

محمد حسین آزاد حیدرآبادی

تیر و نغمہ

اک تیر ہوا پہ میں نے مارا　　　وہ تیر تھا یا فلک کا تارا
جوں ہی نکلا ہوا ہوا وہ　　　معلوم نہیں کہ کیا ہوا وہ
اک راگنی میٹھی میں نے گائی　　　معلوم نہیں کہ کیا ہوئی وہ
دیکھا میں نے جو بعد مدت　　　تھا تیر درخت میں سلامت
وہ راگنی دل میں دوست کے تھی
ویسی ہی جیسی میں نے گائی

خیالات آزاد ۱۹۳۲ء

ہم ترجمے "ساز مغرب" حصہ چہارم صفحہ ۴۵، ۴۶ اور ۴۷ پر دیکھیے۔

سید محمد سلیم واسطی

تیر اور گیت

میں نے ایک تیر ہوا میں چھوڑا
جا گرا فرشِ زمیں پر وہ کہیں — کس جگہ یہ مجھے معلوم نہیں
ایسی تیزی سے میرا تیر اُڑا — کہ نظر دے نہ سکی ساتھ اس کا
میں نے اک گیت ہوا میں گایا
گُم ہوا جا کے فضا میں وہ کہیں — کس جگہ یہ مجھے معلوم نہیں
ہے بھلا ایسی سماعت کس کی — دوڑ میں گیت کا پیچھا کرتی
سالہا سال گذر جانے پر
میں نے وہ تیر دوبارہ دیکھا — ایک برگد کے تنے میں تھا گڑا
اور وہ گیت مرا سب کا سب — دل میں اک دوست کے موجود ملا

"ہمایوں" اپریل ۱۹۴۲ء

حکیم گلچیں کرنالی

عشق اور موت

(۱)

ازل کا سماں کیا مسرت فزا تھا — سہانا سہانا عجب خوشنما تھا
بسی تھی نہ اب تک یہ دُنیائے رنگیں — بسانے کا ساماں مگر ہو رہا تھا
نہایت حسیں بخششیں ہو رہی تھیں — عطائے الٰہی کا دفتر کھلا تھا
ستارے ابھی روشنی لے رہے تھے — مہ و مہر کو نُور، گو مل چکا تھا
گلوں پر تو رنگینیاں لٹ رہی تھیں — حسینوں کو درسِ حیا مل رہا تھا
فلاطوں، ارسطو و بقراط و سعدی — انھیں حکمت و فلسفہ مل چکا تھا
غزالی و رازی، و رومی و حافظ — تصوّف میں کامل انھیں کر دیا تھا
کسی کو شجاعت، کسی کو درایت — کہیں دولت و زر عطا در عطا تھا
ادھر حسنِ لیلیٰ کو ہوتا تھا بخشش — دلِ قیس کو عشق اِدھر مل رہا تھا

فرشتے یہ منظر کھڑے دیکھتے تھے
جمائے پرے کے پرے دیکھتے تھے

(۲)

یہ قدرت کی محفل جمی کی جمی تھی — ہر اک شئے میں اک دلکشی دلبری تھی
تبسّم تھا ہونٹوں پہ غنچوں کے رقصاں — لبوں پر گلوں کے ہنسی آ رہی تھی
چلے تھے نہ جھونکے ابھی تک خزاں کے — ہری شاخ نورستۂ زندگی تھی
جہاں پر ضیا پڑتی تھی ہلکی ہلکی! — سہانی عجب روشنی کی گھڑی تھی
اسی عرصہ میں کچھ "پری زادیوں" کی — نہایت حسیں صف چلی آ رہی تھی
بدن نور جس کا طبیعت سی بجلی — اک اس "دستۂ گل" میں ایسی "کلی" تھی
اداؤں میں فتنے، تبسّم میں شوخی — نظر میں لئے "جادوئے نیستی" تھی
فرشتے سے یہ عشق کے میں نے پوچھا — کہ یہ کون تھی؟ کس چمن کی کلی تھی
فرشتہ ذرا مسکرا کر یہ بولا! — کہ یہ موت تھی، دشمنِ زندگی تھی
یہ کہہ کر فرشتہ نے جا اس کو روکا — مگر موت کچھ عشق سے جھینپتی تھی
چلے گا نہ جادو ترا مجھ پہ ہرگز — کہا عشق نے موت بھی سن رہی تھی
مگر کچھ نہ بولی نگاہیں چرائے — کھڑی شرم آگیں ہنسی ہنس رہی تھی

ذرا آنکھ بچتے ہی شرما کے بھاگی
بہت عشق سے موت گھبرا کے بھاگی

عالمگیر لاہور سنہ ۱۹۴۳ء

ہم ترجمہ، "سازِ مغرب" حصہ اول صفحہ ۲۰۵ و حصہ چہارم صفحہ ۲۳۴ پر دیکھئے۔

نظمؔ

عشق و موت

اک سہانی رات کو چھٹکی ہوئی تھی چاندنی
ماہِ کامل دے رہا تھا، اپنی پوری روشنی
خلد کے صحن معطر میں خراماں عشق تھا
دیکھتا تھا ہر طرف پڑتی تھیں نظریں جا بجا
سامنے ہی صحن میں تھا اک درخت پر بہار
جس کے نیچے پھر رہی تھی موت تنہا بے قرار
اور یہ کہتی تھی ہر دم عشق سے کر کے خطاب
جا یہاں سے یاں ترا کیا کام او خانہ خراب
یہ جگہ ہے دو گھڑی میرے ٹہلنے کے لئے
لطف اُٹھانے کے لئے ہے جی بہلنے کے لئے

عشق نے پھیلائے پَر اُڑنے کو اور رو کر کہا
اب تو ہے تیرا زمانہ جو کہے تو ہے بجا

تیری ہستی اس طرح ہے جس طرح سے اک شجر
ڈالتا ہے دھوپ کے وقت اپنا سایہ خاک پر

بس یونہی اس غیر فانی روشنی میں عمر بھی
اک شجر ہے اور تو ہے اس کا سایہ واقعی

لیکن اس سایہ کو کب ممکن ہے عالم میں بقا
جب شجر گرتا ہے ہو جاتا ہے سایہ بھی فنا

تو فنا ہو جائے گی مجھ کو بقا ہے بے گماں
تا ابد ہر چیز پر یوں ہی رہوں گا حکمراں

"زمانہ" جنوری ۱۹۲۴ء

رنجور عظیم آبادی

کیسا بلانکا

وہ لڑکا جلتے عرشہ پر کھڑا تھا
جہاں سے ہر کوئی چلتا ہوا تھا
پڑے جلتے تھے مردے گرد اس کے
غرض شعلے اسے گھیرے ہوئے تھے
مگر بے خوف وہ لڑکا کھڑا تھا
حکومت اس کی طوفاں پر تھی گویا
وہ گو ظاہر میں اک ننھی سی جاں تھا
مگر رستم سے بڑھ کر پہلواں تھا

بڑھے آتے تھے شعلے گو برابر
بلا اذن پدر ٹلتا وہ کیونکر ؟
مگر اس کا پدر تھا آہ! بے ہوش
پڑا تھا نزع کی حالت میں خاموش
پکارا شور سے کہیئے تو آبا !
ہوا کیا میرا کام اب تک نہ پورا
اسے کیا علم تھا مردہ پدر ہے
مری حالت سے بالکل بے خبر ہے

وہ پھر بولا اگر اب بھی اذن پاؤں
تو ابا جان میں اس جا سے جاؤں
دھماکوں کے سوا واں کون تھا اور
کہ دے دیتا جواب اس کا وہ فی الفور

مگر شعلے بڑھے آتے تھے ہر آن
کہ لے لیں اس بہادر بچے کی جان

جو ان شعلوں سے نکلے گرم انفاس
کیا اس کی جبیں نے ان کا احساس
وہ گویا موت کے منہ میں کھڑا تھا
مگر اس پر بھی وہ ہمت نہ ہارا
پھر اک بار اور لڑکے نے پکارا
یہیں ٹھہرا رہوں کیا اب بھی، ابا؟
کہ اتنے میں بڑھے پاؤں سے شعلے
پھر اس ننھی سی جاں کے سر پہ پہونچے
بھڑک کر شعلوں نے مرکب کو گھیرا
اور آخر جل اٹھا اونچا پھریرا
وہ شعلے آگ کے گویا تھے جھنڈے
جو باتیں کر رہے تھے آسماں سے
وہ لہرائے تھے اس بچے کے سر پر
نہ تھا ہمت میں جس کا کوئی ہمسر

تڑاقے کی پھر اک آواز آئی
خدا جانے کہ کیا لڑکے پہ گذری؟
بتائے حال اس کا کاش طوفاں
کیا مرکب کو جس نے یوں پریشاں
پھریرا ہے نہ ہے مسکان مرکب
نظر آتا نہیں مستول بھی اب
ہوئی گو خاک اک اک چیز اس کی
مگر ان سب سے بہتر ایک شئے تھی
وہ کیا تھی؟ تھا وہ طفل نیک سیرت
بھری تھی کوٹ کر جس میں "اطاعت"

"نظارہ" میرٹھ، جولائی، اگست ۱۹۱۷ء

ہم ترجمے "ساز مغرب" حصہ سوم صفحات ۵۳ و ۵۶ پر دیکھئے۔

محمد حسین آزادؔ حیدرآبادی

ادائے فرض

جل رہا تھا اک جہاز اس پر تھا اک لڑکا کھڑا
وہ رہا تنہا مگر سب لوگ واں سے چل دیئے
گولہ باری نے اُسے تھا ٹکڑے ٹکڑے کر دیا
شعلہ اس کے گرد چمکا دیکھا مردے ہیں پڑے
پھر بھی وہ ٹھہرا رہا ہمّت سے جرأت سے وہاں
گویا طوفاں پر حکومت کرنے وہ پیدا ہوا
تھا جوانمردی کا خُوں اس کی رگ و پَے میں رواں
اس میں خودداری تو تھی گو صورت سے ظاہر بچپنا
باپ بے چارہ تو سب سے پہلے ہی مارا گیا
اس کی آواز ایسی حالت میں بھلا آئے کہاں

وہ پکارا زور سے اے باپ اب کیا حکم ہے
کہئے کہئے ختم میرا کام اب کیا ہو چکا!
کیا خبر اس کو کہ پیکر موت کا کپتان تھا،
بے خبر بے ہوش اپنے بیٹے سے ہے وہ پڑا

"خیالات آزاد"

ہم ترجمے: ساز مغرب، حصہ سوم، صفحات ۵۳ و ۵۶ اور اس حصہ میں صفحہ (۳۰)
پر دیکھئے۔

سید یوسف علی

ترانۂ ہستی

(۱)

غمگیں سروں میں ہے یہ ترانہ عجب ترا
"دُنیا کی زندگی نہیں اک خواب کے سوا"

کیسی یہ تو نے بات کہی میرے سامنے
دھرانا اس کو پھر نہ کبھی میرے سامنے

دنیا ہے خواب دیدۂ غافل کے واسطے
عبرت کا یہ مقام ہے عاقل کے واسطے

آنکھیں تو کھول کیسے ہیں یہ آسماں زمیں
تو دیکھتا ہے جو وہ حقیقت ہے یا نہیں؟

(۲)

چشم خرد سے دیکھ جو تیری ہے زندگی
اصلی ہے واقعی ہے حقیقی ہے زندگی

یہ وہم ہے کہ تا حد مرقد ہے زندگی
اس کے اُدھر تو دیکھ کہ بے حد ہے زندگی

پیوند خاک ہوگا کہ ہے خاک سے بنا
بے شبہ ہوگا قالب خاکی ترا فنا

پر روح ہے وہ شئے کہ نہیں جس کی انتہا
ہے ابتدا ازل تو ابد اس کی انتہا

(۳)

زینت پہ اس چمن کے نہ اترا تو زینہار   بن کر بگڑ گیا ہے یہ جوبن ہزار بار
محو عمل کو ایک ہے سب رنج و انبساط   پژمردہ تجھ کو کرے ہے کیا رنج کی بساط
رنج و خوشی نہیں ہے تو پھر کیا ہے اور کچھ؟   ہاں رنج و انبساط سے اعلیٰ ہے اور کچھ!
اس طرح گامزن ہو کہ بڑھتا سدا رہے
دیشب سے آج، آج سے فردا سوا رہے

(۴)

دعویٰ ہنر کا یہ ہے کہ مشکل ہے سیکھنا   اور وقت کہہ رہا ہے کہ "لے دیکھ میں چلا"
اور اس پر طرّہ یہ ہے کہ مثل درا ہے دل   اک طبل الرّحیل ہے سینے میں کیا ہے دل
کہتا زبان حال سے اپنی ہے برملا   "یہ ہے صدائے کوچ جنازہ ترا چلا"
گر مرد ہے تو کر لے نبرد آزمائیاں
موقع ہے آج کل تری ہوں گی نہ ہڈیاں

(۵)

دنیا مصاف ہستی ہے دن بھر کارزار   اور رات ہے پڑاؤ کہ ستالے ہوشیار
میدان جنگ میں ہو کہ ہو تو خیام میں   آرام سے ہو رات کو یا دن کو کام میں
انساں نہیں جو بن کے یہاں وام و دد رہے   وہ کام کر کہ نام ترا تا ابد رہے
اس معرکہ سے تو نہ مثال غبار اُٹھ
اُٹھتا ہے گر تو بن کے کوئی شہسوار اُٹھ

(۶)

شانۂ کشئ گیسوئے فردا کا کیا خیال	تاریکئ عدم میں جو ہے اس کا کیا ملال ؛
دیروز کے قلق سے ترا دل ہے کیوں بھرا	کیوں دردِ سر ترا ہے گذشتہ کا ماجرا ؛
امروز کے ہے آئینہ پر تیری دسترس	صیقل کر اس طرح کہ نہ باقی رہے ہوس
ہمت ہو دل میں اور بھروسہ خدا پہ ہو
کشتی کو آسرا نہ کسی ناخدا پہ ہو

(۷)

ہو شہرتِ دوام کے ساحل سے ہمکنار	کہتے ہیں تجھ سے اہلِ وطن چپکے سے پکار
"دنیا کی کشمکش سے ہو دم سازِ زندگی	بس کی ہے بات تیری ہو ممتاز زندگی"
جب بادبان نفس کا ہو خاموشی آشنا	جب کشتئ حیات کی ہو موت ناخدا"
"فردائے دہر میں بھی ترا کیف و کم رہے
ریگِ روانِ وقت پہ نقشِ قدم رہے"

(۸)

شاید کہ تیرا نقشِ قدم رہنما بنے	اس تیرہ بخت کے لئے جس پر کچھ آ بنے
جو لطمۂ ہراس میں لنگر گسستہ ہو	اس بحرِ بیکنار میں کشتی شکستہ ہو
سر گشتۂ تلاطمِ امواجِ زندگی	جو تشنۂ ترقی معراجِ زندگی
تاریک شب کو صبحِ طرب زا سے دے بدل
واکھڑے جو سانس وہ دمِ عیسیٰ سے دے بدل

(۹)

تو خواب کے خیال میں بیٹھا ہوا ہے کیا
بس اٹھ کھڑا ہوا اونگھنے سے مدعا ہے کیا

دشتِ عمل میں آبلہ پائی ہمیں دکھا!
ہستی کے خار زار کو گلزار تو بنا

لغزش بس اب نہ تیرے قدم میں ذرا رہے
ہموارہ جستجو ہو تگا پو سدا رہے

راہ طلب میں آگ پہ چل اور ہوا پہ چل
محنت کر اور رکھ تو بھروسہ خدا پہ چل

ہم ترجمے "ساز مغرب" حصہ اول صفحہ ۵۴، ۵۵، ۵۹، حصہ دوم صفحہ ۱۲۸، حصہ سوم صفحہ ۶۵، ۶۸، ۱۲۸، حصہ چہارم صفحہ ۵۸، ۲۱۳ پر دیکھیے۔

برقؔ صدیقی فتحپوری

حُبِّ وطن[1]

ایک طوطے کی جلا وطنی

جذبۂ حبِ وطن ہے بخشش عامِ خدا!
دل میں ہر ذی روح کے ہر وقت ہے اس کا وطن
صرف انساں کے لئے اس کو نہیں مختص کیا
ہے یہ پوری شاں سے حیواں میں بھی جلوہ فگن

ایک طوطا جس کے پر تھے سبز و سرخ و خوش نما
ہو گیا عہد جوانی میں گرفتارِ قفس
خطّۂ مقبوضۂ ہسپانیہ سے بے نوا
ساحلِ ملّا میں پہنچایا گیا بے پیش و پس

[1] ٹامس کیمبل کی ایک شاہکار نظم کا منظوم ترجمہ

وہ وطن کے پر فضا رشکِ جناں گلزار سے
جس میں اس کے پر ہوئے تھے رنگ سے حسن آشنا
آسمان صاف، رنگا رنگ برگ و بار سے
با غم و حسرت ہمیشہ کے لئے رخصت ہوا

اب بجائے رنگ باریٔ گلستانِ وطن
ہر طرف پیشِ نظر ویرانیاں تھیں دور تک
فرش چٹانوں کا بحرِ پر غضب امواج زن
کوہ و درو خار و خس، ویران زمیں اغبر فلک

ایسے ویراں ملک کی آب و ہوائے سرد میں
صرف حسن داشت سے وہ کچھ دنوں گویا رہا
سال خوردہ ہو گیا آخر وطن کے درد میں
رنگ طوطے کے سوا پنکھی پروں کا اڑ گیا

ہو گیا وہ رنج پنہاں سے بظاہر کور و کر
بات کی اچھی بری اس نے نہ خندہ زن ہوا
اتفاقاً ایک دن اس واقعے سے بے خبر
ایک ہسپانی مسافر کا وہاں مسکن ہوا

اس نے ہسپانی زباں میں جب سلام اس کو کیا
کچھ جواب اس کا دیا طائر نے بھی باچشم تر
پھر خوشی سے وہ قفس میں پھڑپھڑا کر چیخ اٹھا
گر پڑا اور کر گیا اس دار فانی سے سفر

جذبۂ حب وطن ہے رحمتِ خاص خدا
ہر گھڑی ہر دل کی گہرائی میں ہے جلوہ فگن
ہمدمِ عیش و نشاط و مونسِ رنج و بلا
قبر تک رہتا ہے یہ غم خوارِ مہجورِ وطن

برق سن کر دیس کی بولی وہ شیدائے وطن
کس قدر مضطر ہوا ، یاد آ گیا جس دم دیار
کس قدر دل میں ہوئی گھر کی محبت موجزن
کر گئی پرواز فرطِ غم سے اس کی جانِ زار

ہم ترجمے ساز مغرب ، حصہ اول صفحہ ۱۱۱ اور حصہ سوم صفحہ ۱۸۷ پر دیکھئے

جلیل قدوائی

ایک تتلی سے

آدھے گھنٹے سے دیکھتا ہوں تجھے
سامنے زرد پھول پر بیٹھے

کتنی مخمور تو ہے اے تتلی!
جیسے پی لی ہے تو نے مۓ تتلی

کس لئے تھم کے رہ گئی ہے تو؟
پھول پر جم کے رہ گئی ہے تو

اب تو دریا بھی تھم نہیں سکتا!
اس سے بڑھ کر تو جم نہیں سکتا

بھول کے اس کو چومتی ہے تو!
یا گلے مل کے سو گئی ہے تو؟

میں سمجھتا ہوں لگ گئی ہے آنکھ
بیٹھے بیٹھے جھپک گئی ہے آنکھ

اور اگر یاں کہیں نسیم آجائے
تیرے اس خواب کا پتہ پا جائے

ٹھنڈی سانسوں سے گدگدائے گی
چپکے چپکے تجھے جگائے گی!

اپنی آغوش میں اٹھا کے تجھے
دامنِ شوق میں چھپا کے تجھے

چھوڑ دے گی ہوا میں لے جا کر
بھینی بھینی فضا میں لے جا کر

باغ کی یہ زمیں ہماری ہے — اور ہم کو بہت پیاری ہے

اس چمن کے درخت میرے[1] ہیں — پھول سارے مری بہن کے ہیں

تو یہاں روز یوں ہی آیا کر! — بے خطر شاخِ گل پہ بیٹھا کر

اُڑتے اُڑتے کبھی جو تھک جانا — دامنِ برگِ گُل پہ سستانا

کسی آزار کا تو خوف نہ کر — بے تکلّف تو بیٹھ پھولوں پر

بیٹھ کر یاں، کریں گے ہم باتیں — مل کے دونوں سُنیں گے ہم باتیں

ہم بتائیں گے تجھ کو دُکھ اپنا — اور تجھ سے سُنیں گے سُکھ تیرا

ذکر پھر، ہوگا اُس زمانے کا — جب نمونہ تھی عیش کا دنیا

آہ! وہ ابتدائے عمرو سِن! — وہ امنگوں کے سال و ماہ، وہ دن!

ہر گھڑی قہقہے وہ بچپن کے — روز و شب چہچہے لڑکپن کے

آج کی کچھ خبر نہ کل کا خیال — زندگی کا نہ کچھ اجل کا خیال

اور طولانی تھے وہ دن کیسے؟ — آج کل کے ہوں بیس دن جیسے

آہ وہ دن کہاں وہ رات کہاں
اپنے جینے میں اب وہ بات کہاں

ماہنامہ "دل" اگست و ستمبر ۱۹۲۵ء

[1] ہم ترجمے "سازِ مغرب" حصہ دوم صفحہ ۹۲ اور حصہ چہارم صفحہ ۵، پر دیکھئے۔

محمد صدیق خان، بہاؔ

تدفین سرجان مور

ڈھول ہی بج رہا تھا واں نہ کوئی اور سازِ غم!
لیے ہم جا رہے تھے سوئے خندق لاش جب اس کی
ہمارے ہیرو کے مرقد پہ اک بندوق سر کرکے
نہ دی اس کو سلامی آخری اک لشکری نے بھی

کیا تھا دفن اسے وسطِ شب تاریک میں ہم نے
لحد اس کی بدقت ہم نے سنگینوں سے کھودی تھی
قمر کی روشنی تو تھی مگر بس دُھندلی دھندلی سی
تھی روشن شمع بھی لیکن تھی مدھم روشنی اس کی

نہ تابوت مکلف ہم مہیا کر سکے اس کو
کفن میں بھی نہ ہم نے اس کی میت کو لپیٹا تھا
بہادر جیسے کوئی سویا ہو آرام کی خاطر
لباسِ حرب میں یوں خاکِ مرقد پر وہ لیٹا تھا

دعائیں تو پڑھی تھیں ہم نے لیکن مختصر وہ بھی
نکالا ہم نے اپنے منہ سے کوئی بھی نہ حرفِ غم
لگائے ٹکٹکی بس دیکھتے تھے مردہ چہرے کو
کہ طاری اپنے دل پر فکرِ فردا سے تھا رنج و غم

تھے جب مشغول ہم اس کی لحد تیار کرنے میں
یہی رہ رہ کے ہم لوگوں کے دل میں خیال آتے تھے
کہ کر دیں گے عدو اور اجنبی پامال گور اس کی
مگر ہم بحر کی موجوں پہ کوسوں دور پر ہوں گے

حقارت سے کریں گے گفتگو مرحوم کی بابت
عدو آکر مذمت بھی کریں گے قبر پر اس کی

نہ پروا ہوگی مطلق گر وہ سونے دیں وہیں اس کو
بنائی ہے لحد اہلِ وطن نے جس جگہ اس کی

ابھی ہم یہ مہم آدھی بھی سر کرنے نہ پائے تھے
کہ صد افسوس ہماری واپسی کا وقت آپہونچا
یکایک دُور سے آئی گرج توپوں کی کانوں میں
عدو کا حملۂ بے شست شد و مد سے جاری تھا

اُتارا قبر میں آہستہ ہم نے بادلِ غمگیں
جُدا کر کے شہیدِ قوم کو میدانِ شہرت سے
نہ کندہ کی عبارت ہی نہ کوئی لوحِ استادہ
فقط اس کی شجاعت اور عظمت ساتھ تھی اس کے

ماہنامہ "آجکل" ستمبر ۱۹۴۵ء

نوٹ: ہم ترجمہ حصہ سوم صفحہ ۱۵۴ پر دیکھئے۔

سکائی لارک

آزاد سب افکار سے   آزاد ہے ہستی تری
کیا چیز ہے مستی تری
دنیا کی شورش گاہ سے   ہے دور تر بستی تری

تیری نوائے شوق سے   سارا جہاں معمور ہے
اور آسماں معمور ہے
کیا جانے کن اسرار سے   تیری فضا معمور ہے

وہ اُڑنا اور آکاش میں   نظروں سے چھپ جانا ترا
وہ دُور کاشانہ ترا
گاتے ہوئے اُڑنا ترا   اُڑتے ہوئے گانا ترا

جاتی ہے جب تو عرش پر   اپنے حریم ناز سے

آراستہ ہر ساز سے
گرتے ہیں نغمے فرش پر تیرے پر پرواز سے

تو اک مجسم شعر ہے جذبات کا فوّارہ ہے
اور عشق کا گہوارہ ہے
یا آب و گل کی شکل میں کوئی صدا آوارہ ہے

ہے لیلیٰ محمل نشیں اور تیرا بن ہے آسماں
دشت کہن ہے آسماں
اور بادلوں کی نازنیں تیرا وطن ہے آسماں

تو اس کی دلدادہ ہوئی وہ چاہنے والا ترا
ہے چاند متوالا ترا
یہ کہکشاں کیا چیز ہے اک منجمد نالہ ترا

اک تیر ہے تو وقت کی ٹیڑھی کماں کے درمیاں
جسم اور جاں کے درمیاں
یا ایک نقطہ ہے زمین و آسماں کے درمیاں

یا ساز موجودات میں اک نغمۂ بے تاب ہے
یا قطرۂ سیماب ہے
یا زندگی کی نیند میں کوئی پریشاں خواب ہے

اک نغمۂ سیال ہے یا رُوحِ آزادی ہے تو
ننھی سی شہزادی ہے تو
جنگل میں منگل تجھ سے ہے صحرا کی آبادی ہے تو

اُڑ کر زمیں سے چرخ پر تو صورتِ شبنم گئی
رستے میں لیکن تھم گئی
گویا لہو کی بوند تھی جا کر فضا میں جم گئی

تو رفعتِ پرواز سے سوئے زمیں تکتی نہیں
اُڑتی ہوئی تھکتی نہیں
اور اس بلندی تک نظر میری پہنچ سکتی نہیں

کیا آسماں اور کیا زمیں یہ گردشِ ایّام کیا
زنجیرِ صبح و شام کیا
تیری نظر میں ہیچ ہے آغاز کیا انجام کیا

"ہمایوں"، جون سنہ ۱۹۲۹ء
ہم ترجمہ: ساز مغرب، حصہ سوم صفحات ۹۲، ۹۳ پر دیکھیے۔

شمسؔ لکھنوی

فصلِ بہار کا آخری پھول

حسرت نصیب ہے یہ گُل آخری بہار
اُف بچ گیا ہے باغ میں تنہا کھلا ہوا
مُرجھا گیا ہے ساتھ کا ہر اک حسین پھول
تختہ چمن کا آج ہے سونا پڑا ہوا
اس قسم کا نہ پھول ہی باقی ہے باغ میں
اور ہے نہ اب کہیں کوئی غنچہ بچا ہوا
شرما کے جو دکھائے تماشائے رنگِ رُخ
یا اُس کو دیکھ کر یہ کہے ہائے کیا ہوا

تنہا تجھے نہ چھوڑوں گا اے غم کش فراق
ڈر ہے کہ تیرا شاخ پہ مُرجھا نہ جائے دل

از بسکہ سوتے ہیں گُل خوش رنگ سینکڑوں
جا تو بھی سو انھی میں انھی لیے خودوں میں مِل
بکھرا رہا ہوں سبزہ پہ میں تیری پتّیاں
اس طرح لطف سے کہ رہیں مل کے متصل
جس جا ترے رفیق چمن ہیں پڑے ہوئے
جن کو ہوائے بو ہے نہ پروائے آب و گل

لازم ہے میں بھی جلد یونہی پیروی کروں
مٹ جائے جب کہ رسمِ محبت کا سلسلا
اور جب کہ ارتباط کے خوش رنگ ہار سے
ہو جائے ہر لڑی دُرِ شہوار کی جُدا
ہو جائیں مردہ جس گھڑی سینوں میں سچے دل
اور مرنے والے قوم پہ ہو جائیں سب فنا
پھر ہائے کیا پسند کرے کوئی زندگی
اس بے ثبات دہر میں رکھا ہوا ہے کیا

سالنامہ "نظارہ" جنوری ۱۹۱۷ء

ہم ترجمے ، "سازِ مغرب" حصہ دوم صفحہ ۱۳۴ ، حصہ سوم ، صفحات ۱۳ ، ۱۵ ، ۱۸ / ۱۹ اور حصہ پنجم صفحات ۱۱ ، ۱۳ اور ۱۵ پر دیکھیے۔

محمد حسین آزاد حیدرآبادی

فردوسِ بریں

میری ماں تم سے سُنا جنّت کا ذکر
واں کے لوگوں کو نہیں ہے کوئی فکر
کس جگہ ہے وہ مقام دل فریب
کیا نہ ہوگا وہ ہمارا دیدہ زیب
کیا یہ فردوس اور جنت ہے وہاں
پھول کھلتے اڑتے پروانے جہاں

میرے بچے واں نہیں ہے واں نہیں

کیا وہاں ہے تارڑ ہوتے ہیں جہاں
ہیں کھجوریں پکتی زیرِ آسماں
کیا سمندر کے جزیروں میں ہے تیز
چلتی ہیں جس جا ہوائیں عطر بیز
اور پرندے خوش نما رکھتے ہیں پر
جس میں رنگارنگ آتے ہیں نظر

میرے بچے واں نہیں ہے واں نہیں

کیا وہ اس جا ہے کہ جو ہے دُور تر　　ہیں وہاں چشمے سنہری ریت پر
لعل کی کرنیں چمکتی ہیں جہاں　　اور معدن میں ہیں ہیرے ضُو فشاں
اور کنارے ہیں درخشندہ گہر　　ہے یہ جنّت مادرِ نیکو پسر
میرے بچے واں نہیں ہے واں نہیں
آنکھیں دیکھیں اس کو ان کو کیا مجال　　کان بے بہرہ ہیں واں ہے قیل وقال
مثل ان کا خواب میں دیکھا نہیں　　اس میں غم اور موت کا کھٹکا نہیں
پتّے اس کے رہتے ہیں ہر دم ہرے　　ابر سے اور تبر سے ہے وہ پرے
میرے بچے وہ وہیں ہے وہ وہیں

خیالاتِ آزاد ، سنہ ۱۹۳۲ء

ہم ترجمے "سازِ مغرب" حصہ سوم صفحہ ۲۲۱ اور حصۂ پنجم صفحات ۲۵ و ۲۷ پر دیکھیے۔

مہاراج بہادر برقؔ دہلوی

قوسِ قزح

بالائے آب دوڑتی پھرتی ہیں کشتیاں
دامانِ بحر پر ہیں سفینے رواں دواں
بادل ہوا میں اُڑتے ہیں جو زیرِ آسماں
ان میں جو دلکشی ہے سفینوں میں وہ کہاں

دریاؤں پر بندھے ہوئے جو پُل ہیں جا بجا
وہ سب بجائے خود ہیں نہایت ہی خُوشنما
قوسِ قزح سے ان کو مگر واسطہ ہے کیا
جلوہ نمائی اس کی ہے زینت دہِ خلا
گردوں سے ایک جادۂ رنگین ہے تا زمیں
شکلِ کماں خمیدہ ہے مگر کتنا دل نشیں

"مطلع انوار" صفحہ ۹۳

ہم ترجمہ "سازِ مغرب" حصہ دوم صفحہ ۱۴۷ پر دیکھئے۔

محمد حسین آزادؔ حیدر آبادی

حکایت

اونٹنی کے بچے نے اس سے کہا
دم تو لے چلتی رہے گی تا کجا

بولی وہ میں تو ہوں پا بند قطار
ہاتھ میں میرے نہیں میری مہار

لے چلی کشتی کو ساتھ اپنے قضا
زور مارے لاکھ اپنا ناخدا

غیر سے آزار مت لے زینہار
دینے والا ہے ترا پروردگار

مانگ اسی سے ہیچ ہیں سب ماسوا
وہ نہ دے تو کوئی دے گا تجھ کو کیا

وہ نوازے تو ترا بیڑا ہے پار
ورنہ لاحاصل ہے کر کوشش ہزار

'خیالاتِ آزاد'

محسن زیدی

جو گزر گیا

کب سے ہیں موجود اس دنیا میں دشت و سبزہ زار
شاخِ گل پر نغمہ زن کب سے ہے غنچوں کی چٹک
کب سے ان کے حسن کو بیدار کرتی ہے صبا؟
اور لے جاتی ہے اپنے دوش پر ان کی مہک
ہے قدیمی حسن ان کا سرمدی ان کا جمال
گل کھلے، کھلتے رہے، کھلتے رہے، کھلتے رہے
اور بہاروں پر پلٹ کر بار بار آئی بہار
کب سے ہیں موجود دنیا میں دریا آبشار
گنگناتے آرہے ہیں جو فرازِ کوہ سے
وہ فرازِ کوہ صدیوں سے جہاں پر سرد یخ
سو رہی ہے آسماں کی نیلگوں چادر تلے
صفحۂ گیتی پہ لکھتے جا رہے ہیں داستاں

گا رہے ہیں گیت ماضی حال و استقبال کے
ان کا ہر قطرہ ارسطو کی طرح ہے ہوشمند
راز دار بزم ہستی واقف سرِ جہاں
ہم بنی نوع بشر صدہا برس سے ہیں یہاں
زندگی سے اپنی عالم کی حقیقت ہے عیاں
اور وہ افسانے عبارت جن سے اپنے خواب ہیں
عندلیبانِ عدن کی ہیں وہ خوش الحانیاں
جاگ کر اس خواب سے کرتے ہیں سرگوشی کبھی
اور کھو جاتے ہیں پھر گزرے ہوتے ایام میں
آدمی اک پھول ہے آتی ہے جس پر یوں بہار
دیکھنا جس کو خزاں لکھا نہیں انجام میں

ظفر علی خاں

اخبار کا چندہ

کرتا ہے چچا سے گلہ بے مایہ بھتیجا
ملتا نہیں کچھ بھی مجھے محنت کا نتیجہ
کی مجھ سے اب اخبار نویسی نہیں جاتی
چکی سحر و شام یہ پیسی نہیں جاتی
گھٹنے مرے ہاتھوں میں نہ دیکھو گے تم اتنے
پتلون پہ پیوند نظر آتے ہیں جتنے
اُجلی بھی نئی بھی تھی کبھی میری یہ پتلون
کچھ روز سے بدلا ہے مگر اس نے نیا جُون
پیوند نے ہر ہفت کیا میرے سریں کو
ملتا نہیں یہ نُور قلندر کی جبیں کو
چندہ نہیں دیتے ہیں خریدار ہمارے
پھر کیوں نہ الگ پود سے ہوں تار ہمارے
بھجوائیے اخبار کا باقی ہے جو چندہ
گر آپ کو ہے ہم کو بھی ہے پیٹ کا دھندا

پہلے ہی کتر بیونت سے پتلون ہے چھوٹی
ایسا نہ ہو جاڑوں میں یہ بن جائے لنگوٹی

"نگارستان"، لاہور، دسمبر ۱۹۱۶ء

محمد مصطفےٰ حسین آصفی

کشورِ اسلام

جب تخت و کُلہ تاراج ہوئے برباد ہوئے شمشیر و عصا
تھے دہر کے ساحل پر ٹکڑے ٹوٹی ہوئی کشتی کے گویا
بُھولے ہوئے عہدِ ماضی کے افسانے زندہ کرنے تھے
اور کام بہت کچھ باقی تھے تکمیلِ حیاتِ آدم کے
نقارے فتح و نصرت کے سب گونجے اور خاموش ہوئے
وہ قصّے پرانی شوکت کے ہنگامۂ خواب دوش ہوئے
یونان کا بکھرا شیرازہ روما۔ سے ہما معدوم ہوئے
ویرانے مصر و بابل کے معمور صدائے بوم ہوئے
پھر مستقبل کو ماضی سے پیدا کیا طبعِ انساں نے
پھر ارض و سما کو فتح کیا اُمید نے زورِ ایماں نے
چھائی ہوئی جہل و ضلالت کی تاریکی سب کافور ہوئی
خورشیدِ رسالت جب چمکا سب دُنیا بقعۂ نُور ہوئی
جھنڈا رہا عزم انساں کا بالائے قیودِ وقت و مکاں
ایماں نے ممالک فتح کیے ماضی کو نہ تھا جس کا امکاں

بشیر احمد

بیداریٔ روح

ندائے ربانی

بھیجتا ہوں تجھ کو میں اک نرم و نازک راگنی
بس کہ شیریں ہے صدا اس بحر نا محدود کی
جاگ جاگ اے رُوح اپنے مدّتوں کے خواب سے
باہر آ۔ غار الم سے ، بچ نکل سیلاب سے
توڑ دے ہاں توڑ دے ہستی کی اس زنجیر کو
چھوڑ دے دنیا کو اس دنیائے بے تنویر کو

تیرتا سا نیل اک میں نے بنایا آسماں
اور میں نے اس کی رگ رگ میں بھریں رنگینیاں

بادِ طوفاں خیز کی میں ہی ہوں عالم افگنی
بھولے بھالے چاند کی ہوں ہلکی ہلکی روشنی
دُور تاروں میں فلک پر جھلملاتا میں ہی ہوں
اور زمیں کو بوئے گل بن کر بساتا میں ہی ہوں

میں ہی ہوں جس نے بنائی ننھّی منّی سی نسیم
جو کیا کرتی ہے چل کر جنگلوں کا دل دو نیم
میں ہی ہوں جس نے بنایا مہرِ آتش زا کا نور
میں ہی ہوں جس نے دکھایا ظلمتِ شب کا ظہور
میں ہی ہوں وہ جس نے بھر دیں آنسوؤں سے بدلیاں
میں ہی ہوں جس نے بنائے یہ زمین و آسماں
پھر بھی ہوں میں منتظر تیری مروت کے لئے
آہ میں بے تاب ہوں تیری محبت کے لئے

میں نے بھیجا تجھ کو سُکھ بھی دُکھ بھی اور کچھ پیار بھی
تا زمیں پر رہ کے مجھ کو یاد کرے تو کبھی
سینکڑوں چیزوں میں ہے پرتو فگن میرا ظہور
پھول میں میری ہی بُو کرنوں میں ہے میرا ہی نور

اٹھ مری جاں دیکھ پر چاندی کے دیتا ہوں تجھے
پیار کرنے کے لئے گودی میں لیتا ہوں تجھے

اٹھ مری جاں تا ترے دل سے مرا مل جائے دل
گلشن الفت میں پھر میرا ترا کھل جائے دل

جوابِ انسانی

دُور دُور اندر سے بحر تیرہ و تاریک کے
کیا ہے یہ آواز اے دل سُن رہا ہوں میں جسے

نُور کیسا ہے یہ جس کی آسمانی روشنی
میری جانب آ رہی ہے آ رہی ہے آ رہی

کرتی ہے اک نرم و سیمیں راگنی سرگوشیاں
اور بلاتے ہیں مجھے لے لے کے نغمے ہچکیاں

وائے قسمت آ کے اس دنیا میں دل بھٹکا مرا
کس سے جی اٹکا ہے میرا کس سے جی اٹکا مرا؟

سن رہا ہوں نغمہ ہائے دل پذیر و دلستاں
ایک شیریں آسمانی جذبہ ہے جس میں نہاں
جاگ اُٹھا میرا مردہ دل بھی گانے دو مجھے
آہ جانے دو مجھے تم آہ جانے دو مجھے

بس کہ ہے اے راگ تجھ میں سرمدی تابندگی
موت ہے تجھ میں نہاں، تجھ سے عیاں ہے زندگی
کانپ اُٹھا جس سے میرے سازِ دل کا تار تار
آہ میرے واسطے کس کی ہے یہ کس کی پکار؟

ہاں بلاتا ہے مجھے تو میرے ربِ ذوالجلال
چاہتا ہوں میں بھی اٹھوں لیکن اٹھنا ہے محال
کس طرح اے جانِ جاں میں آؤں پہلو میں ترے
درد ہے دل میں مرے اُف درد ہے دل میں مرے

میں نے ہر تارے میں دیکھی آہ تیری روشنی
تھی سمندر پر بھی تیرے حسن کی ضو افگنی

دُور افق پر ڈوبتے سورج کے لالہ زار سے
تو نے اک آواز دی، آواز دی تو نے مجھے

جال میں جنجال میں دنیائے بے درماں کے ہائے
تجھ سے دور اے جانِ من یہ جی مرا مجھ کو ستائے
جب سے مجھ پر چل گیا تیری محبت کا فسوں
روز و شب تیرے لئے تیرے لئے بے چین ہوں

ہاں تمنّا ہے تری میرے دلِ مجبور کو
کس طرح دیکھوں مگر یا رب میں تیرے نُور کو
قلب آلودہ ہے اور آوارۂ دنیا و دیں!
نفس پاکیزہ نہیں ہے، آہ! پاکیزہ نہیں

میں غلط کہتا ہوں لیکن اے خدائے دو جہاں
درد و غم میں نے سہے تیرے لئے سب بے گماں
درد و غم سے جب ہوا اک دیدۂ غمناک میں
ہو گیا پھر پاک میں اپنے گنہ سے پاک میں

چھوڑتا ہوں آج ان چھوٹی سی دنیاؤں کو میں
کلفتوں کو ان کی اور ان کی تمنّاؤں کو میں
چھوڑتا ہوں چھوڑتا ہوں اس چمن کا آب و گل
جس سے جی اٹکا ہے اور بھٹکا ہے جس سے میرا دل

اک نشاطِ حیرت افزا اب میری رہبر بنی
ہو چکی دنیائے دوں میں ختم میری جاں کنی
غیر فانی پاک دل آزاد ہو کر اب یہاں
تیرے پاس آتا ہوں تیرے پاس میں اے جانِ جاں

"ہمایوں" جنوری ۱۹۳۹ء

ظفر علی خاں

تاجدارِ دکن

اے خسروِ ذی شوکت و ذی حشمت و ذی فر
دریہائے سخن سے ہے مکمل ترا افسر
رہتے ہیں بہم مختلف اقوام و مذاہب
باعافیت و امن ترے عہد میں مل کر
لایا ہوں ترے واسطے اخلاص سے شاہا
میں تہنیتِ عید کا گلدستہ بنا کر
یہ ہدیۂ ناچیز پسند آئے جو شہ کو
پایہ ہو ثریا سے مری نظم کا برتر
سب اپنی رعایا پہ نظر ہے تری یکساں
ہے ایک تجھے ہو وہ برہمن کہ مسلماں
تو امت احمد کا ہے سرتاج تو آقا!
ان کا ہے جو رکھتے ہیں جبیں قشقہ سے تاباں

سورج کے پجاری ہیں تری آنکھ کا تارا
جو چھوڑ کے آئے تھے یہاں ساحل ایراں
تو ان کا خداوند ہے جو اس کے ہیں بندے
جو بحر کی موجوں پہ ہوا رات کو پویاں

جب دیکھتے ہیں ہم ترے دربار کی شوکت
یاد آتی ہے بغداد کی گزری ہوئی عظمت
اک جشن میں تیرے نظر آئے وہ چراغاں
ہے جن سے الف لیلیٰ کے افسانوں کی زینت

دیتی ہے دعا ساقئ مستانہ ادا کو
ہر صبح و مسا پیتی ہے جب ذوق سے خلقت
وہ جام چھلکتا ہوا تیری غزلوں کا
آتی ہے نظر جس میں تصوّف کی حقیقت

پر رونق و آباد ترے شہر ہیں صدہا
جنگل میں ہے منگل کا دل آویز تماشا
جو ملک ترے زیر نگیں آج ہے اس میں
آثار پدید است صنادید عجم را
معمور خزانے ہیں ترے اور ترے خرمن
اور ان کے محافظ ترے خدام ہیں شاہا

شامل ترے شاہا کرم و فضلِ خدا ہو
تو حامیٔ حق ماحیٔ آئینِ جفا ہو
عفّت کی شجاعت کی فضیلت کی کرے قدر
تو ناصرِ کیش شہِ لولاک لما ہو
فردوسیٔ طوسی تھا جن اوصاف کا وصاف
درجہ ترے اوصاف کا ان سے بھی سوا ہو

اشعار ترے درج ہوں ضرب المثلوں میں
اور اسم مبارک ترا اک رکنِ دُعا ہو

"نگارستان" سنہ ۱۹۳۶ء

محمد یعقوب خاں کلاآم

مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات

اے خدائے خشک و تر! اے بادشاہِ بحر و بر
عہدِ مستقبل میں ہو اس سلطنت کا راہبر
شاہ کو توفیق دے ایسی کہ یہ ملکِ قدیم
بھائی چارے کی ریاست ہو بہ اوصافِ دگر
کیسے بھائی؟ وہ جو محنت اور دماغی فکر سے
زندگی کو عالمِ امکاں کی کردیں خوب تر
یہ جلالت زندۂ جاوید کرشن کو عطا
تا ہو تیرے فضل سے نخلِ تمنا بارور
اور ملکہ کو جو ہے قصرِ امارت کی مکیں،
اس قدر تابِ تحمل دے کہ وہ باکر و فر
شاہ کے ہر فرضِ روزانہ میں بن کر حصہ دار
پایۂ تکمیل کو پہونچائے باعقل و ہنر

شاہ بانو اور شہ دونوں کو اپنے فضل سے
اس قدر توفیق دے، اے بیکسوں کے دادگر
تاکہ بیکاروں کی خاطر وہ کریں فکرِ معاش
اور مایوسوں کو امیدوں کا بخشیں تاجِ زر
دے بصیرت راہِ خوب و زشت میں پہچان کی
اور سیدھی راہ چلنے کے لئے نورِ بصر
اور دے قلب عمل میں اس قدر جوش و خروش
ہوں مکمل کام سب کے خوب سے بھی خوب تر
کر عطا امن و صلح، اپنی مقدس شانتی
اور مسرت انسداد جنگ کی توفیق کر
اور جو ارباب ہیں برطانیہ پر حکمراں
یا ہیں نوآبادیوں میں مالکانِ خیر و شر
دے انھیں فن جہانبانی میں ادراک و شعور
مشوروں کو ان کے کر عقل و خرد سے بہرہ ور
اے ہماری ہر تمنا جو کہ ہو نیکو نہاد
پوری کر اس سلطنت میں جو ہے اب آغاز پر

"زمانہ" مئی ۱۹۳۷ء

صابر

فرشتوں کی محبت

وہ دن جب تو کلی تھی اور کلی بھی ناشگفتہ تھی
وہ دن جب تو نوا تھی اور نوا ہی لب میں خفتہ تھی
وہ دن جب تو گہر تھی عقدِ معصومی میں سفتہ تھی
وہ دن جب برق تھی اور برق بھی ناواقفِ حاصل
وہ دن بھی، آہ! وہ الّھڑ پنے کے دن بھی کیا دن تھے

وہ دن جب تھی نہ اُلفت کے شرارے کی تپش دل میں
وہ دن جب تھی نہ رنج و غم کے کانٹے کی خلش دل میں
وہ دن جب تھی نہ بے باکانہ جلووں کی کشش دل میں
وہ دن جب عشق کی رنگینیوں سے بے خبر تھا دل
وہ دن بھی، آہ! وہ الّھڑ پنے کے دن بھی کیا دن تھے

وہ دن جب نکہتوں سے نا آشنا سا تیرا گلشن تھا
وہ دن جب برقِ غم کی زد سے باہر میرا خرمن تھا
وہ دن جب تیرا بچپن تھا، وہ دن جب میرا بچپن تھا
تو اپنے حسن سے غافل، میں اپنے عشق سے غافل
وہ دن بھی، آہ! وہ الھڑپنے کے دن بھی کیا دن تھے

ماہنامہ "ایشیا" ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۵ء

محمد مصطفےٰ حسین آصفی

ترانۂ عرب

عرب ظلمت شب میں پنہاں تھا سارا
نظر آیا اسلام وقتِ سحر
وہ شمشیر تابندۂ نورِ زندہ
اڑے وقت کی جسم و جاں کی سپر

پیمبر ہوئے ایک ہم میں سے پیدا
تو ان کی دُعائیں بنیں چارہ گر
"تری رحمت بیکراں سے خدایا
بنے دین اسلام اپنی سپر"

جو چونکے تو دشتِ عرب سے نکل کر
مسخر کیے ہم نے سب بحر و بر
وہی دین اسلام تھا اپنا خنجر
وہی دین اسلام اپنی سپر

لیا تیغ سے کام فتح و ظفر کا — اِدھر سے اُدھر تک جہاں میں مگر
سپر پہ اُڑا امنِ عالم کا جھنڈا — درخشاں تھی جس دم جبینِ سپر

ہوا ہم کو حاصل وہ اوج حکومت — کہ آگے کسی کے جھکائے نہ سر
بجز ایک قوت کے یعنے مشیت — ہے جب تک بھی اسلام اپنی سپر

محبت کی خاطر لڑے ہم لڑے جب — یہ تعلیم اسلام کا ہے ثمر
کہ اسلام ہے نوعِ انساں کا مذہب — یہی ہے مسلماں کی تیغ و سپر

اخوت کے جب عہد و پیمان باندھے — صداقت سے قائم رہے عہد پر
تو حق کے طرفدار پھر بن کے اُٹھے — رہا دین اسلام اپنی سپر

مگر ہم جو بدلے زمانہ بھی بدلا — ہوئی دور رحمت گرے اپنے پر
زوال آگیا بن کے نیت کا ثمرہ — لیا دین سے جب نہ کارِ سپر

ہے گرنے میں لیکن اُبھرنے کا مژدہ — سزا کا ہمیشہ ہے اچھا اثر
اٹھالیں گے اپنی سپر ضرب خوردہ — بہت جلد دھو دیں گے زنگِ سپر

خدا ہی کو زیبا ہے عظمت جہاں کی
جھکے جس کے آگے سدا اپنے سر
مصیبت کی پروا نہیں کرتے غازی
ہے جب تک بھی اسلام اپنی سپر

ہم آزاد ہر دم رہے اور رہیں گے
بشر کے نہ آگے جھکائیں گے سر
کبھی جابروں سے دبے نہ دبیں گے
ہے جب تک بھی اسلام اپنی سپر

سرنظامت جنگ

نِدائے مدینہ

اسی خاک مدینہ سے اٹھا جب شعلہ ایماں کا
نیا عالم نظر آیا وہ عالم تھا مسلماں کا
جہاں آتش کدوں میں ہو گئی زیرِ زمیں آتش
فلک پر پھر ہوا روشن ستارہ اوج ایماں کا
عراق و شام پر سے جب اُٹھا اوہام کا پردہ
نئی شوکت تھی دُنیا کی نیا فر چرخ گرداں کا
وہ دُنیا تھی خدا ہی کی زمیں و آسماں اس کا
وہ خالق تھا وہ مالک تھا وحوش و جن و انساں کا
پیمبر بھی اسی کے تھے نہ دعویٰ تھا حکومت کا
رسالت اک ہدایت تھی خلاصہ اس کے فرماں کا
کہاں خسرو کہاں قیصر وہ سارے مٹنے والے تھے
یہی تقدیر کا منشا یہی تھا، حکمِ دوراں کا

شہنشاہِ جہاں سے بھی تھا جس کا حکم بالاتر
فقیری میں اُسے تھا فخر اپنے عسر شاداں کا
نہ ہرگز طالب زینت نہ محتاج زر و گوہر
دل صادق جو مخزن تھا کلام حق و عرفاں کا
اگر تھی شام تک محنت تو ساری شب عبادت تھی
قناعت کا ہر اک فاقہ سپاس اپنے نگہباں کا
حفاظت دین کی ہر دم صیانت قوم کی ہر دم
عمل صالح مصیبت میں سپر تھا مردِ میداں کا
ہوئی جب اس سعادت سے مسخّر قوم اعدا کی
کرم فتویٰ تھا فاتح کا عفو مژدہ تھا احساں کا
خلیفہ اس شہِ بے تاج کے عالم میں غالب تھے
یہ حاکم شام و ایراں کا وہ مصر افریق و ہسپاں کا
نہ دولت سے نہ شوکت سے فقط ایماں کی قوت سے
ملا اسلام کو درجہ جہاں میں تھا جہاںباں کا
مدینہ اس کا مرکز ہے یہی دار الحکومت ہے
یہی سرچشمہ عزّت کا یہی اسلام کی جاں کا
ابھی تک موجزن ہے یاں شعاع نور اسلامی
اگرچہ سایہ عارض ہے کسی ادبار پنہاں کا

اگر مفقود دولت ہے تو کیا مفقود ہمّت بھی
فلاکت میں بھی سر اُونچا کہاں ہے اب مسلماں کا

مسلمانوں کی غفلت سے مسلمانوں کی ذلّت سے
مقامِ حیف و عبرت ہے یہ منظر شہرِ ویراں کا

مگر اسلام کی ہمّت کرے گی اس کو پھر زندہ
یہی ویرانہ پھر ہوگا نمونہ باغِ رضواں کا

یہاں گرد و غبارِ فقر میں پنہاں ہے نُورِ حق
یہاں ہر ذرّہ ذرّہ بھی ہے مظہر شمسِ تاباں کا

نہیں مایوس ہوں گے ہم کبھی قادر کی قدرت سے
دلِ مومن خدا کا گھر نہیں محتاج ساماں کا

مسلمانانِ عالم تم (تونگر ہو کہ مفلس ہو)
کرو اس شہر کی خدمت اگر دعویٰ ہے ایماں کا

کشش دل کو ہے مومن کے شمال و مشرق و مغرب
جہاں مومن کو ملتا ہے خزانہ نُورِ ایماں کا

نہ یہ ایماں توہّم ہے نہ یہ ایماں تصوّر ہے
نہ لفظوں ہی میں رکھا ہے ذخیرہ اس کے ساماں کا

عمل ان کی وصیت ہے کہ جن کے پاک ہاتھوں سے
بنی اسلام کی دنیا نتیجہ دل کے ارماں کا

عمل سے اسوۂ حسنہ ملا تھا جب لقب اُن کو
عمل تقلید ہے ان کی عمل ہے حکمِ قرآں کا

کہو کیا صرف نا توں سے کہو کیا صرف باتوں سے
بنو گے امتی ان کے لقب لو گے مسلماں کا

اُٹھو اب خوابِ غفلت سے مدینہ کی طرف دیکھو
ہر اک دل میں مدینہ ہی وطن ہے ہر مسلماں کا

جو اپنے گھر سے آیا ہو۔ رسول اللہ کے گھر میں
تو ان کا جو طریقہ تھا وہی ہو ان کے مہماں کا

کرے وہ قوم کی خدمت یہی مقبول ہے سنّت
یہی مقصد عبادت کا یہی شیوہ ہے ایماں کا

وہ دولت دے وہ محنت دے وہ دل دے فی سبیل اللہ
کہ احساں سے ملے اس کو دوامی اجر احساں کا

خدایا ہر مسلماں کو عمل کی تو ہی طاقت دے
کہ دعوائے مسلمانی مسلّم ہو مسلماں کا

حنا

کس جوش سے چمن میں بُلبل چہک رہی ہے
ہر سمت نگہتِ گُل کیسی مہک رہی ہے

کیا وقت ہے مزے کا کیا لُطف آرہا ہے
لے کر گھڑوں کو کوئی دریا پہ جا رہا ہے

شاخِ حنا پہ بیٹھا چھوٹا سا اک پرندہ
کریاں کر کے نغمہ کس جوش سے ہے گاتا

رنگ مسی تو لب پر ہر ایک کے جمے گا
قشقہ جبینِ بُت پر شام و سحر لگے گا

چشمِ سیہ کا سرمہ لاکھوں کی جان لے گا
بوسے لبوں کے اکثر کم بخت پان لے گا

اے مہ وشانِ عالم لیکن حنا نہ چھوڑو
جلدی سے آؤ دوڑو اس کو ضرور توڑو

یہ ہاتھ پیارے پیارے یہ ہاتھ گورے گورے
یہ انگلیاں دل آور آنکھوں کے لال ڈورے
کیا پتّیاں ہیں نازک کیا ٹہنیاں ہری ہیں
پھولوں سے کیا لدی ہیں کیا رنگ سے بھری ہیں
ہاتھوں میں کچھ لگاؤ منہدی کو گھول کر تم
پاؤں میں کچھ لگاؤ کانٹے میں تول کر تم
نیرنگیٔ زمانہ برگِ حنا سے سیکھو
ہر دل میں گھر بنانا اس کی ادا سے سیکھو
رہتے ہیں جو چمن میں گاتے ہیں گیت اس کے
لالہ کو اور گُل کو بھاتے ہیں گیت اس کے
پر لوٹ کر یہ جس دن آتی ہے گھر کسی کے
مَلتا ہے ہاتھ کوئی چڑھتی ہے سر کسی کے
دل خوش کرے گا کوئی ہاتھوں میں اپنے مَل کر
کوئی وفا رہے گا بس دل ہی دل میں جل کر

ماہنامہ الناظر، یکم اکتوبر ۱۹۱۲ء

سیّد اظہر علی

ساحل اور بحرِ مواج

(یا کنارِ بحر)

(۱) ۔ سمندر ہے دولھا ۔ کنارہ دلھن

ابھی حال ہی میں بیاہے گئے ہیں
نئی حسرتیں اور ارماں نئے ہیں
اُمنگوں کا دریا جو اک موجزن ہے
دلھن پا کے، دولھا خوشی میں مگن ہے

(۲) ۔ صدف سے سجا کر وہ ابرو دلھن کے

ہے پیچھے کو ہٹتا ذرا فاصلے پر
اسے دیکھتا ہے وہ پاؤں سے تا سر
لپک کر وہ لیتا ہے بوسے دلھن کے
تصدّق بھی ہوتا ہے اس کی پھبن کے

ماہنامہ الناظر، یکم اگست ۱۹۱۴ء

ارشد تھانوی

آسودگیٔ طبع

مانند تاج کے ہے میرا ضمیر مجھ کو
اور مطمئن تخیّل فرحت کا میری ساماں
دیتا ہے قلب میرا لُطفِ کثیر مجھ کو
جنّت ہے میری گویا سینے میں میری پنہاں

مسرور اور قانع ہیں اپنے حال پر ہوں
محدود خواہشیں ہیں سہل الحصول میری
تکیہ کئے ہوئے میں اس ذوالجلال پر ہوں
یعنی ہر اک دُعا ہے وقفِ قبول میری

آزاد سیم و زر کی افکار سے ہوں بالکل
مال و متاع میرا ہے ایک عام نیکی
ہر گز نہیں کِسی کا منّت کشِ توسل
خود دوسروں سے کرتا ہوں صبح شام نیکی

غصّے سے مشتعل میں ہوتا نہیں ہوں ہرگز
لیکن گر آ ہی جائے تو روکتا نہیں ہوں
وقتِ عزیز اپنا کھوتا نہیں ہوں ہرگز
فرطِ غضب میں اپنے کو ٹوکتا نہیں ہوں

لیکن یہ جوشش میرا ہو جاتا جب ہے زائل — ہو جاتا ہے طبیعت میں اک سکون پیدا
دشمن کو اپنی جانب کرلیتا ہوں میں مائل — کرتا ہے دوستی یوں میرا جُنون پیدا

دل میں کوئی تمنّا یا آرزو نہیں ہے — جس کا نتیجہ آخر ہوتا ہے نامرادی
ہاں لطفِ ایزدی کی امید دل نشیں ہے — طاری ہے جس سے ارشد مجھ پر وفورِ شادی

"العصر" جلد (۴) شمارہ (٦)

محمد مصطفےٰ الحسینی آصفی

راہِ مدینہ

پہاڑیاں وہ مہیب! اور وہ لق و دق صحرا
ہرا بھرا نظر آتا نہیں جہاں پودا
خموش دشت، جہانِ سراب کا منظر
چمکتی ریگ ہے اور آفتاب کا منظر
ہے محوِ قطع منازل یہاں کوئی زائر
قدم سے کشمکشِ ضعف و شوق ہے ظاہر
غضب کی بادِ سموم اور دشت پتھریلا
وہ ڈھیر قبر نما، استخوانِ اُشتر کا
نظر اُٹھا کے مسافر نے جس طرف دیکھا
پہاڑیاں نظر آئیں کہیں، کہیں صحرا
اگر یہ سچ ہے وہاں کوئی لطف زیست نہ تھا
نہ نیشِ غم سے بھی خالی تھا موت کا کھٹکا

عجیب شان سے اک قافلہ گزرتا ہے
منازلِ سفر اونٹوں پہ قطع کرتا ہے

ہیں موٹریں بھی مسافر سوار ہیں جن میں
وہ سنگ ریزوں پہ ان کی کرخت آوازیں

پیادہ پا یہ مسافر بھی چلتے چلتے رُکا
نگاہِ شوق اُٹھی، دستِ اشتیاق بڑھا

مذاق اُڑا کے چلی جب کہ آخری موٹر
گرا وہ ضعف کے عالم میں ریگ صحرا پر

ببول پاس رفاقت کو اک نظر آیا
ذرا سا، یہ بھی غنیمت تھا دوست کا سایہ

غرض وہ رینگتا پُر خار سائباں پہنچا
خراب و خستہ وہیں ریگ پر دراز ہوا

کھچا وطن کا سماں دیدۂ تصوّر میں
وہ سایہ دار دوطرفہ درخت، اور سڑکیں

پھری نظر میں کبھی وہ کنوؤں کی سیرابی
وہ بھینی بھینی ہوا جھومتے درختوں کی

سنائیں نغمۂ شیریں طیور صحرا کے
تو چھیڑیں بھیرویں اپنی بھی بے سرے بھنورے

غرض کہیں بھی مسافر جو راہ میں ٹھیرے
ہوئے مہیا، یہ اسباب استراحت کے

عجیب یاس بھرا یاں سماں ہے پیش نظر
صعوبتوں نے بھلایا ہے دل سے خوف و خطر

حیات و موت کی اک کشمکش نمایاں ہے
سمجھ رہا ہے کہ یاں موت زیست یکساں ہے

خیال آیا کہ مجھ کو سفر ہے طولانی
رہِ طلب میں تو ہے جدّ و جہدِ روحانی

قدم نہ اُٹھ سکیں آگے تو لڑکھڑانے دو
چلیں نہ تیز تو آہستہ اُن کو جانے دو

پہاڑیوں سے پرے ہے وہ منزلِ ارماں
محال ہے کہ تصوّر میں آئے اس کا سماں

وہ شہر جس کو شہِ دیں نے انتخاب کیا
وہیں ہے دل جلے عاشق کی جنت الماویٰ

وہ شہر خاص ہے اُس ذاتِ برگزیدہ کا
قدم سے جس کے یہ ظلمت کدہ ہوا اُجلا

انھیں سے اہلِ جہاں کو پیام حق پہنچا
کہا انھیں نے کہ انساں ہے اشرف و اعلیٰ

کمال جذبۂ ایمان و عشقِ صادق نے
نیا چراغ جلایا ہے دل میں زائر کے

اشارہ پا کے یہ کہتا ہوا وہ اُٹھ بیٹھا
نہیں ہے ڈر کہ بُلاتا ہے وہ مرا آقا

ہوئی ہے ولولۂ عشق کی مسیحائی
نئی جو قالب مُردہ میں اس کے جاں آئی

رہِ طلب میں ہوا گامزن وہ دشت نوَرد
خیال وسعتِ صحرا کا ہو گیا سب گرَد

ہے مطمحِ نظر اس کوہسار کا منظر
نبی کے شہر کے قُرب و جوار کا منظر

ہے اشتیاق بھرا دل تو منتظر آنکھیں
حِصار پر نظر آتی ہیں منحصر آنکھیں

دَوا دوش ہے غضب کی بلا کی جہد و جد
یہ راہ وہ ہے کہ جس کا حساب ہی ہے نہ حد

حیات و موت کی گویا ہے کشمکش باہم
بھرا آفتاب، نہیں آفتابِ حشر سے کم

چلا ہے جان گھسیٹے قدم قدم آگے
یہی ہے دُھن کہ بڑھے جائے دمبدم آگے

شہید دشتِ طلب، مبتلائے عزمِ صمیم!
اسیر بندِ قضا، کشتۂ رہِ تسلیم!

چڑھا پہاڑ پہ آخر، خدا خدا کرکے
اُٹھی کمالِ ادب سے نگاہِ شوق آگے

نظر کے سامنے اک پُر فضا تھا نظارہ
نبی کے دینِ متیں کا وہ پہلا گہوارہ

نشیب شہر کو گھیرے ہوئے جبل کے حصار
وہ اونچے اونچے مدینہ کے خوش نما مینار

دھڑکتے دل کو مسافر نے تھام تھام لیا
ہوا نصیب جو دیدارِ گنبدِ خضرا

نہ پوچھو حال کہ اک بیخودی ہوئی طاری
نظارہ کرتے ہی جذباتِ دل کو ٹھیس لگی

ہزار دل بھی جو ہوتے تو پھٹ کے رہ جاتے
ہزار آنکھیں بھی ہوتیں تو اشک بہ جاتے

کُھلا نہ حال کبھی دل کی بے قراری کا
جگر کی آگ کا، آنکھوں کی اشک باری کا

وہ بات ہے کہ کوئی فلسفی بتا نہ سکا
وہ راز ہے کہ ہمیشہ رہے گا سربستہ

یہاں سے بس اسے چلنا ہے کچھ قدم آگے
نشیبِ شہر نظر آرہا ہے ٹیلے سے

ٹھنی ہے دل میں کہ وقتِ غروب سے پہلے
ہو جس طرح بھی یہ تھوڑی سی راہ طے کر لے

لگا دی، ہائے! نظارہ نے آگ سینے میں
یہ آرزو ہے کہ بس شام ہو مدینے میں

پہنچ لوں روضۂ اقدس تو مدّعا مل جائے
تمام عمر کی چاہت کا یہ صلہ مل جائے

خیال آیا کہ پہلے نماز ادا کر لوں
نزولِ نور سے ہونے لگا جو دل کو سکوں

عجب نماز تھی وہ بھی کہ سجدہ ریز ہوا
تو پھر زمیں سے نہ اُٹھا وہ طالبِ مولا

اختر

خط شعاعی

اور مری خط شعاعی پر نظر پڑتی ہے جب
سوئے مغرب ہے جو سرگرم خرام امواج پر
اِس مُذہّب اور شعاعی جادۂ تنویر پر
چاہتا ہوں میں اگر ہو جاؤں سرگرم سفر
یہ مجھے لے جائے شاید اچھے رستے کی طرف
پرتنعّم اور پر رونق جزیرے کی طرف

"العصر" جلد نمبر (۴)

سیّد مقبول حسین احمد پوری

آزادی

جہاں دل کو ہو خوف سے بے نیازی
جہاں سر بلندی سے ہو سر فرازی

جہاں علم ہو عام اور مفت حاصل
گھروں میں نہ دیوارِ تفریقِ حائل

جہاں گفتگو ہو کھری اور مدلّل
جہاں سعی ہو کاوشوں کی مکمل

جہاں عقل کی بات جی میں سمائے
نہ خُو اور خصلت سے بیکار جائے

تری رہنمائی سے تخئیل انساں
جہاں ہو عمل اور وسعت کی خواہاں

خدایا اس عالم میں بیدار کر دے
ہمارے وطن کو خبردار کر دے

"زمانہ"، جنوری ۱۹۳۵ء

بشیر احمد

پھولوں کے دن

پھولوں کے دن
جھولوں کے دن
کھیلوں کے دن
میلوں کے دن
یہ دن یہ راتیں کب تلک ؟ میٹھی سی باتیں کب تلک ؟
آئے گی آخر وہ گھڑی
ٹوٹے گی جاں کی جب لڑی
چھوٹے گا سب کا ساتھ جب
چل دیں گے خالی ہاتھ جب
یہ رنگ رلیاں پھر کہاں ؟ یہ پھول کلیاں پھر کہاں ؟

گیتوں کے دن
پریتوں کے دن
چاہت کے دن
راحت کے دن
مل کر یہ گانا کب تلک ؟ ہنسنا ہنسانا کب تلک ؟
یہ راحتیں ہیں چار دن
یہ چاہتیں ہیں چار دن
اک دن بلائے جائیں گے
آخر سلائے جائیں گے
باہم یہ چاہت پھر کہاں ؟ باہم یہ راحت پھر کہاں ؟

اک خواب سے جیسے کبھی
پیدا ہوئی تھی زندگی
اک خواب کے اندر کبھی
ویسے ہی پھر کھو جائے گی

"ہمایوں"، مئی ۱۹۲۹ء

محشر عابدی

دُور اُفتادہ

(۱)

ہوئے جب ہم جُدا دونوں، خموشی تھی، رواں آنسو
شکستہ قلب، وارفتہ تھے ہم، محوِ فغاں ہر سو
ہماری سحر ہائے ہم جلیسی مٹتی جاتی تھیں
شبِ فرقت کی گھڑیاں وحشت افزا بڑھتی آتی تھیں
تمہارا رنگ بدلا، طرز بدلا، غم کی صُورت تھی
تمہارا جسم ٹھنڈا اور سکتہ کی سی حالت تھی
مرے دل نے کہا مجھ سے، شگوں اچھا نہیں ایسا
خدا جانے کہ دکھلائے گی قسمت وقت اب کیسا

(۲)

خیالِ بے وفائی ہے، مگر خاموش رہتا ہوں
تمہاری یاد میں لیکن عبث مدہوش رہتا ہوں

تمہارا ذکر ، میری موت کا پیغام ہوتا ہے
محبّت اُف محبت کا یہی انجام ہوتا ہے
مجھے بھولے تو کیا، تم ایک ہی میرا تصوّر ہو
نہ آؤ بھی تو کیا، موجود میرے دل کے اندر ہو
مگر تا عمر غم کی داستاں کہتا رہوں گا میں
سُناؤں گا تمہیں اور تم سے پھر سُنتا رہوں گا میں

(۳)

مسرّت جب تھی تم سے اب میں تنہائی میں روتا ہوں
نہ دن کو چین آتا ہے، نہ میں راتوں کو سوتا ہوں
ستایا تم نے، لیکن اب تصوّر بھی ستاتا ہے
رولایا تم نے، لیکن اب تصوّر بھی رولاتا ہے
اگر برسوں میں قسمت پھر کبھی تم سے ملائے گی
تو خود ہی دیکھ لینا، جو مری حالت دکھائے گی
ملوں گا کس طرح تم سے، ابھی بتلاؤں تم کو کیا
رواں ہوں گے وہی آنسو خموشی اور وہی سکتا

شادؔ عارفی

عمرِ دراز

اے وہ کہ جو مرے نام کے ساتھ
زندانی جسم خود بنا ہے
دل تیرے فرار کے خطر سے
اک قصرِ حسین بنا رہا ہے
دیوار میں ہیں مائل بلندی
دیواروں سے عمر مدّعا ہے
جتنی کہ بڑھی ہے پختہ مغزی
دل اتنا ہی ظلمت آشنا ہے

ہر عقل کے سن و سال کے ساتھ
ہوتا ہے بلند اس کا قد بھی
گھرتا ہے پھر ان مصیبتوں میں
ہوتی نہیں جن کی کوئی حد بھی
ممکن نہیں انحراف اس سے
ممکن نہیں اس کا کوئی رد بھی
ہے جتنی بھی زاید عمر جس کی
اتنی اسے معرفت سے کد بھی

"ہمایوں" اکتوبر ۱۹۳۲ء

ٹیگور کی ایک نظم کا ترجمہ جو ورڈز ورتھ کی نظم کا ترجمہ ہے

دوست محمد خان

رُوحِ مسرّت

محبت سے محبت ہے مجھے گو اس سے واقف ہوں
کہ اس کے پر ہیں اور یہ برق سے بھی تیز اُڑتی ہے
پر اے رُوحِ مسرّت سب سے بڑھ کر تجھ سے اُلفت ہے
کہ تو جانِ محبت اور حیاتِ جاوداں بھی ہے
مرا ویرانۂ دل آ کے پھر آباد فرما دے!
ہمیشہ کے لئے اک غمزدہ کو شاد فرما دے

"ہمایوں" مارچ ۱۹۳۴ء

محمد عنایت خان حیرتؔ امرتسری

بیوہ کا گیت

ابتدائے زندگی تھی کیف زا
آرزوؤں کا تھا اک طوفاں بپا

تھا جوانی میں یہی تو مشغلہ
ان دنوں مجھ کو یہ کیا معلوم تھا

زندگی میں اک حبابِ آب ہے
حسرتوں کا افتتاحی باب ہے

یک بیک پلٹا دیا تقدیر نے
کر دیا گھائل قضا کے تیر نے

بے خطا میں، اور وہ بھی بے خطا
دونوں صابر پر نہ صابر تھی قضا

باغ امید آہ ویراں کر گئی
یاس کے کانٹوں سے دامن بھر گئی

میں رہی دنیا میں رونے کے لئے
غم کے ہاتھوں جان کھونے کے لئے

لوٹ لی تقدیر نے میری خوشی
وہ جوانی اور اس کا حُسن بھی

ناگہانی موت سب کچھ لے گئی
داغ اک محرومیوں کا دے گئی

اب کہ ہے پامالِ غم باغِ حیات،
میں ہوں اور فرقت کی اک تاریک رات

اضطراب افزا ہے تنہائی مجھے
بارہا مانگی نہ موت آئی مجھے

سروش لاہور، ستمبر ۱۹۳۰ء

محروم

آج

اُٹھو اُٹھو! دن گذر چلا ہے، پڑے ہو کن وسوسوں میں جاگو
حریف جوشن پہن چکے ہیں نہیں مناسب کہ ان سے بھاگو
جگہ جو ہے معرکے میں خالی، تمہارے ہی انتظار میں ہے
کرو دل و جاں سے اس کو پورا، وہ فرض جو کارزار میں ہے
ہیں شیخ چلّی کے خواب چھوڑو خیال آئندہ و گذشتہ
کہ "آج" ہے اور کچھ نہیں ماہ و سال آئندہ و گذشتہ

اُٹھو اُٹھو! یہ خیال آئندہ چھوڑو طاری ہے جو دلوں پر
کہ "جا کے گھمسان کی لڑائی میں ہم دکھائیں گے اپنے جوہر
کریں گے یا جا کے ہم کسی دن ہوائی قلعہ کوئی مسخّر
مصاف میں منہ کی کھائے گا ہم سے لاکھ ہو کوئی دیو پیکر"
تمہارے آئندہ کارناموں میں ہوگی بے شبہ شانداری
ملے گی توقیر تم کو بے شک اگر ہے قسمت میں فضلِ باری!
مگر نہ پاؤ گے بازوؤں میں تم اپنے طاقت سے "آج" جتنی
تمہاری میدان میں پھر نہ ہو گی کبھی ضرورت ہے "آج" جتنی

اُٹھو اُٹھو! جو رکاوٹیں ہیں خیال میں بھی انھیں نہ لاؤ
جو روز و شب کل گذر چکے ہیں تم اپنے دل سے انھیں بھلاؤ
ستم ہے زنجیر یاد ایام پائے مردانہ پر کڑی ہے
اسیر آج اس کے ہو گئے تم کہ جس کی بوسیدہ ہر کڑی ہے
ہو خواہ شاداں، ہو خواہ غمگیں، نکال دو پاؤں سے سلاسل
یہ زنگ خوردہ ہیں اور پُرانی، تو توڑنا ان کا کیا ہے مشکل؟
نگاہ ڈالو نہ مڑ کے طومار کہنہ پر تم کبھی، مگر ہاں!
سبق وہ پڑھ لو جو جنگ "امروز" میں ہو جرات فزائے مرداں

اُٹھو اُٹھو! دن گذر چلا ہے۔ یہ آتی دھیمی سی جو صدا ہے
صدا یہ دشمن کے کوچ کی ہے، تمہارے سر پر جو آ گیا ہے
کرو نہ ہتیار تیز کرنے میں دیر ہرگز کہ وقت کم ہے
وگرنہ پھر تم ہو اور سر پر تمہارے وہ وقتِ پُر الم ہے
کہ آنے والی لڑائی کے خواب سے ہو بیدار جس گھڑی تم
تو یہ سُنو پھر کہ "ہو چکی وہ لڑائی" تب ہوش ہوں نہ کیوں گم

ماہنامہ "ادیب" الہ آباد، جولائی ۱۹۱۱ء

محمد مصطفیٰ حسین آصفی

حینِ حج

زوال آجائے سلطنت کو حکومتیں بھی تباہ ہو لیں
کرشمے سطوت کے مٹ چکیں سب اور عظمتیں گردِ راہ ہو لیں
نہیں ہے اس سرزمین میں لیکن نشان تغیّر کا آشکارا
چمک رہا ہے یہ دشت و در میں ہنوز توحید کا شرارا
وہ شعلہ بن کر کرے گا دنیائے دوں کو پھر ایک بار روشن
سنہری کرنوں سے دیکھنا پھر نظامِ ہستی بنے گا کُندن
پھر ایک بار احتشامِ حق کا جہاں میں لہرائے گا پھریرا
طلسم توڑے گا ظلمتوں کا کرے گا باطل کا غرق بیڑا
عرب کے دل اور دست و بازو کی یاں نمایاں ہیں یادگاریں
لباسِ ظاہر کی شوکتیں گو نظر نہیں آتیں اس فضا میں
عیاں ہیں آثار ریگِ تاباں سے نور ایمان و ذکرِ رب کے
نظر یہاں آرہے ہیں ہر سو نقوش آزادی عرب کے

ہماری دنیائے کبر و نخوت سے ہے عرب کو کمال نفرت
الگ بناتا ہے جب وہ چاہے جہاں میں اک کشورِ اُخوت

دل عرب کو جہاں میں ہر دم تلاش ہے لازوال شئے کی
وہ نفع ناپائدار دنیا کو کھو کے پاتا ہے جنس باقی

ہے زیورِ علم سے وہ عاری بدی سے لیکن ہے پاک دامن
اُسے ہو اندیشۂ ضرر کیا حصارِ مذہب ہو جس کا مامن

اسی میں مضمر ہے رازِ طاقت سدا نڈر وہ رہا اسی سے
رہے گا آزاد دو جہاں میں نہ ہوگا مغلوب وہ کسی سے

ہے دل کا مضبوط اور صابر مشیتِ ایزدی پہ راضی
مقابلہ کو ہے ہر بلا کے وہ راسخ الاعتقاد کافی

ہے غیر معمولی اُس کی قوتِ کرشمہ روحانیت کا اُس کی
ہے مژدۂ جانفزائے ماضی میں رازِ وجدانیت کا اُس کی

چراغِ مذہب کی روشنی میں رہ ہدایت پہ گامزن ہے
اور اپنے آقا کو دیکھنے کے خیال میں سر بسر مگن ہے

اشارہ لاتقنطو کا پیہم پڑھا رہا ہے دل اُس کا ہر دم
زیارتِ ارضِ پاک سے ہے خیالِ روزِ جزا کا محکم

منصور

التجائے محبّت

مجھ کو نہ چھوڑ اے سحر تماشا　　ظالم ظالم یہ کیسا دھوکا
اس کی بھی کچھ تجھ کو خبر ہے　　کس مشکل میں دل مضطر ہے
کیا تو مجھ کو چھوڑ سکے گا　　رشتۂ اُلفت توڑ سکے گا

ظالم ساحر مجھ کو نہ چھوڑ
ظالم ساحر مجھ کو نہ چھوڑ

تجھ کو مری اُلفت کی قسم ہے　　جس کا عوض یہ رنج و الم ہے
تجھ کو قسم ہے اپنی وفا کی　　جس نے مجھ سے آہ دغا کی
تجھ کو قسم میری مشکل کی　　تیرے تغافل کے حاصل کی

ظالم ساحر مجھ کو نہ چھوڑ
ظالم ساحر مجھ کو نہ چھوڑ

امین الرحمٰن

اظہارِ اُلفت

نہ کیجئے کبھی اظہار اپنی اُلفت کا
ہے بہترین محبت وہی جو ہو خاموش
نسیم صبح کے مانند چاہیئے اُلفت
خرام جس کا نہیں آشنائے جوش و خروش
مگر تھی ضبط محبت کی تاب مجھ کو کہاں
سُنا دیا اسے افسانۂ دلِ پرجوش
یہ سن کے خوف سے چل دی وہ کانپتے ڈرتے
کہ منتظر تھی مری جس کے واسطے آغوش
ابھی نہ گذری تھی اس بات کو بہت مدّت
کہ پاس اس کے اک آیا مسافرِ خاموش
جو لے گیا اُسے چُپ چاپ ایک آہ کے ساتھ
وہ عمر بھر کے لئے مجھ سے ہو گئی رُوپوش

"ہمایوں"، مئی ۱۹۳۸ء

سید محمد یوسف قیصر

گہوارے کا راگ

ملائم اور ہلکے ہلکے جب گہوارہ چلتا ہے!
تو اس میں چھوٹے بچوں کا بہت کچھ دل بہلتا ہے
پڑا چپ چاپ ہے گہوارے میں آؤ ذرا دیکھیں
بہت مجھ کو بھلی لگتی ہیں وہ ہنستی ہوئی آنکھیں
نہیں سوئے گا وہ جب تک سلائے گی نہ ماں اس کی
ذرا دیکھیں بھری ہے نیند آنکھوں میں کہاں اس کی

بہت ہی زور سے چلّا رہا ہے آج تو جھینگر
نظر آتے ہیں تارے ڈبڈباتے چرخ کے اوپر
چمکتی پھرتی ہے گلدم، گری ہے اوس پھولوں سے
ابابیلیں چلیں گھر کی طرف اُڑ کر ببولوں سے

میں جاؤں تجھ پہ قربان اے مرے نُورِ نظر سو جا
مرے نُورِ نظر سو جا! مرے لختِ جگر سو جا
پیاری نیند آکر تیری آنکھوں میں سما جائے
نسیم صُبح آکر پھول بستر پر بچھا جائے
ترے گہوارے کو روشن کرے گی چاندنی آکر
پڑے گا حُسن کا تیرے اثر جب چاند کے اوپر

پڑا سوتا ہے بچہؔ اپنے گہوارے میں کروٹ سے
شگفتہ پھول سا چہرہ ہوا ہے مسکراہٹ سے
ادائیں کھیلتی پھرتی ہیں اس بے ساختہ پن پر
محبّت کی نگاہیں پڑ رہی ہیں اس کے بچپن پر

ماہنامہ "العصر" لکھنؤ اپریل، مئی سنہ ۱۹۱۶ء

محمد مصطفےٰ احسین آصفی

حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ

(فتح ایران کے بعد)

صدائے حمد خوانی سے مدینہ گونج اُٹھا ہے
کہ ایراں فتح کر کے لشکرِ اسلام پلٹا ہے

دلاور آرہے ہیں محو ہے چشمِ تماشائی
تجسّس میں ہے کوئی دل کہیں غائب شہیدوں کی

اکابر مثل پروانہ ہیں گِرد اپنے خلیفہ کے
کہ استقبال لشکر ہو نبی کے صحنِ مسجد سے

سپاہِ قوم ہے سردار کی اپنی قیادت میں
کھڑے ہیں باادب سب حاکمِ اعلیٰ کی خدمت میں

رکھا مالِ غنیمت لا کے سب آقا کے قدموں پر
محبت موجزن دل میں نظر مولا کے قدموں پر

خلیفہ کو ہوا احساسِ باطن اُن کے تیور سے
ہیں شکر آمیز جذبات مسرّت ہر بہادر کے

امیر المومنیں کی بے نیازی بھی نمایاں ہے
زمیں تختِ مرصع ، سادگی تاجِ درخشاں ہے

تعجب خیز ہے منظر کہ فاتح شام و ایراں کا
کھڑا ہے ساتھ سب کے ذکر کیا ہے شوکت و شاں کا

بلند و راست قامت سے اُولوالعزمی نمایاں ہے
متیں نورِ شریعت سے رُخِ انور درخشاں ہے

لگائی مُہرِ دیں جس نے تمام اوراقِ عالم پر
عمر کا نام ہے نقشِ دوام اوراقِ عالم پر

انھیں کا حکم تھا وقاص ایراں کی خبر لینا
شہِ مغرورِ ایراں کو ذرا نیچا دکھا دینا
مُغوں کی سرزمیں کو گندگی سے پاک کر دینا
اور آبِ تیغ سے آتش کدے نمناک کر دینا"

وہ افسر سعد سا ، اور وہ مہم تسخیرِ ایراں کی
گری اکبارگی آتش کدوں پر برقِ یزداں کی

وہ ایرانی حکومت کا ستارہ آخری ڈوبا
ہوئی صبحِ ہدایت آفتابِ اسلام کا چمکا

بنایا سعد کو حق نے فرشتہ ابرِ رحمت کا
کیا پھر کام ان سے انسدادِ کفر و ظلمت کا

کھڑے ہیں سعد پھیلائے ہوئے مالِ غنیمت کو
اٹھا کر لائے ہیں بے انتہا ایراں کی دولت کو

درخشاں ڈھیر ہر سو بے بہا لعل و جواہر کے
کبھی آتش پرستوں کے یہی اسباب زینت تھے

نظر ڈالی عمرؓ نے سرسری اور پھیر لیں آنکھیں
دکھا کر حال ماضی کی طرف پھر لے چلیں آنکھیں

سبق وہ یاد آیا جو شہِ دیں نے پڑھایا تھا
کہ دنیا کے کھلونوں سے نہ بہلانا تو دل اپنا

کھڑے سب دیکھتے ہیں شاہِ منصور و مظفر کو
یہ دن وہ ہے اگر ہوتا تو رشک آتا سکندر کو

مگر کچھ اور ہے دنیا خیالاتِ خلیفہ کی
زیادہ ہو گئی ہے فکر اب دینِ حنیفہ کی

نظر آئی انھیں ظاہر پرستی اہلِ دُنیا کی
بنا ہے جلوۂ زر رُوح کا سامانِ بربادی

خیال آیا کہ لو! زیرِ نگیں ہے خطّۂ ایراں
پڑا ہے سامنے یاں پرزے پرزے نقشۂ ایراں

یہی پیشین گوئی تھی مکینِ سبز گنبد کی
خدا کے برگزیدہ وہ نبی یعنی محمدؐ کی
سبق اَلعظمۃُ لِلّٰہ کا ہم کو پڑھایا ہے
میں اک ناچیز بندہ ہوں بزرگی حق کو زیبا ہے
فنا ہو جائے گی دم بھر میں یہ دنیا و مافیہا
جہاں کے بادشاہوں کو بھی چلنا ہے یہی رستہ
حکومت، جاہ و ثروت، شہرت و حشمت کے سب دھندے
دلِ کمزور کو ہیں پھانس لینے کے یہی پھندے
کھلونے اعتباری ہیں حقیقت کچھ نہیں ان میں
فنائے روح ہے ان سے مسرت کچھ نہیں ان میں
ہمیشہ چلنے والا حکم تیرا ہے خداوندا!
زمین و آسماں کی سلطنت کے حافظِ یکتا
تو ربّ العالمیں ہے اور مالک عرش کُرسی کا
مکان و لامکاں تیرے ازل تیرا اَبد تیرا
رہے کچھ دیر مستغرق سمندر میں خیالوں کے
ذرا کچھ سوچ کر پھر آپ مجمع کی طرف پلٹے
کھڑا تھا اک عرب محو تماشہ اُس کو بلوایا
لباسِ خسروی ایراں کا پھر اُس کو پہنوایا

کہ شکلِ یزد جرد آنکھوں سے اپنی دیکھ لے پبلک
سبق حاصل کرے دنیا کی ہیں سب نیتیں مہلک

کھڑا ہے اک عرب پہنے ہوئے وہ تاج اور خلعت
ہوا کرتی تھی جس سے خسروِ ایران کی زینت

مرصّع موتیوں کے زیور اور مالے پہنوائے
جواہر جس قدر بھی تھے اسے سارے پہنوائے

پھر اس کے بعد فرمایا کہ "ناحق جان دی اُس نے
تکبر سے گیا مارا، نہ حق کی جب سُنی اُس نے

ہلاکت میں پڑا افسوس مال وجان کے بدلے
خریدا جنسِ باطل کو حق و ایمان کے بدلے"

قاضی احمد میاں اختؔر

شام

ہے وہ ساعت باعثِ فرطِ طرب میرے لئے
جب کہ ہو جاتا ہے دن کی روشنی کا اختتام
اور شعاعِ مہر بحرِ پُرسکوں کی سطح پر
گر کے ہوتی ہیں گداز اس آبِ دریا میں تمام

آہ تب وہ خوابہائے عیش کی پُرلطف یاد
تازہ کر دیتی ہے پھر ایامِ پیشیں کو مرے
پھر کے پیچھے کی طرف پھر قوّتِ تخیّل میں
سرد آہیں بھرتی ہیں فرطِ غم و اندوہ سے

اور مری خط شعاعی پر نظر پڑتی ہے جب
سوئے مغرب ہے جو سرگرم خرام امواج پر
اس مذہب اور شعاعی جادۂ تنویر پر
چاہتا ہوں میں اگر ہو جاؤں سرگرم سفر

یہ مجھے لے جائے شاید اچھے رستے کی طرف
پر تنعّم اور پر رونق جزیرے کی طرف

ماہنامہ "العصر" لکھنؤ، اپریل مئی ۱۹۱۶ء

سرور جہاں آبادی

دُعا

وہ روشنی عطا کر عمرِ رواں کو یارب
چمکوں میں شمع بن کر اس تیرہ انجمن میں
میری شمیم سے ہو تسکیں جہاں کو یارب
مہکوں میں پھول بن کر اس وادئ کہن میں

یارب بنا دے میری ہستئ بے بقا کو
اک گیت پیارا پیارا اک نغمۂ دل آرا
اور وہ فسونِ دلکش دے لحن جاں فزا کو
ہوں اہلِ انجمن کے جینے کا میں سہارا

ہاں میری زندگی کو ایسا عصا بنا دے
ہو جس سے دستگیری ایک ایک ناتواں کی
اور لازوال دولت وہ مجھ کو کبریا دے
حاجت بر آئے جس سے ہر زار خستہ جاں کی

اس زیست کو بنا دے یارب وہ جام زریں
ہو جلوہ ریز جس میں تیری شراب وحدت
دنیا کی کاوشوں سے ہرگز نہ ہوں میں غمگیں
لب پر ہو جوشِ مستی میں نغمۂ مسرت

رسالہ "ادیب" مارچ ۱۹۱۱ء

محمد مصطفےٰ حسین آصفی

معجزاتِ اسلام

یہ کس کا سینۂ اقدس بنا تجلّی زار
یہ کس کے گوش مبارک ہیں محرمِ گفتار
کہ ایک کلمۂ اقراء کی نغمہ ریزی سے
جو اُٹھ گئے ہیں رُخِ کائنات سے پردے
ہر ایک ذرّہ میں ہے آفتاب دیکھ رہا
خدا کی ذات کو یوں بے حجاب دیکھ رہا
کھلا یہ راز کہ ہر سُو اسی کی ہے تنویر
وہی ہے خالق یکتا وہی رحیم و قدیر
محمّد عربی نام اور لقب اُمّی
طویل عمر، وطن دشت. قوم ہے وحشی
ملا یہ حکم کہ پڑھ منہ سے کلمۂ اقرار
یہ لفظ روزِ ازل سے ہوا زماں پیدا

زبانِ پاک سے پھر آپ نے تلاوت کی
کلیدِ ملّتِ بیضا اسی سے ہاتھ آئی
یہ معجزہ ہے کہ عالم اسی سے فتح ہوا
اسی کا بیٹھا ہوا ہے قلوب پر سکّہ
اِسی سے قوم عرب نیک و پاکباز بنی
نڈر، دلیر، مگر دل میں تھی خدا ترسی
غریب لوگ تھے باشندگانِ ریگستاں
مگر انھیں نے کیا فتح خطۂ ایراں
انھیں کے خوف سے آتش کدے ہوئے ٹھنڈے
اُکھڑ گئے تزک و احتشام کے جھنڈے
یہ معجزہ ہے ہوا پھر نجات کا ساماں
جہاں میں پھیل گئی پھر جو شہرتِ ایراں
انھیں نے نار پرستوں کی خیرہ آنکھوں کا
دوائے روشنئ حق سے پھر علاج کیا
وہ لائے غیب پہ ایماں بنے کتاب پرست
خدا پرست ہیں اب تھے جو آفتاب پرست
فنا کی راہ کو چھوڑا رہِ بقا پائی
دلوں سے زنگ جو دھویا گیا جِلا پائی

یہ معجزہ ہے کہ پھر کفر و نار کے بندے
جھکے ہیں نورِ سماوات و ارض کے آگے

یہ معجزہ تھا کہ پھر آئی شام کی شامت
ملی جو خاک میں روما کی مشرقی عظمت

عرب کی نوکِ سناں نے ہلا دیں بنیادیں
بنی تھیں برقِ غضب بدویوں کی تلواریں

کہاں وہ لشکرِ اسلام کا جواں سیلاب
کہاں وہ سلطنتِ شام کا ضعیف حباب

تھے کارنامے بڑے روم و اہلِ روما کے
مگر یہ دوڑتے سیلاب کو نہ روک سکے

پھر اس کے بعد ابوالہول نے پڑھا کلمہ
قدیم دین کا لیکن نئی شہادت کا

وہی جو تھا لبِ موسیٰ پہ ہر گھڑی جاری
سنی تھی بارہا فرعون نے گرج جس کی

یہ معجزہ ہے کہ پھر مصر دین دار ہوا
سیاہی دور ہوئی نور ہر طرف پھیلا

عرب کے قبضۂ قدرت میں شہرِ اسکندر
کہ اس کے دل میں سمایا ہے عالمِ برتر

پھر اس کے بعد تھا قرطاجنہ کا ملکِ قدیم
کبھی جو دولتِ روما کا تھا حریف عظیم
جو ایک عرصۂ دیرینہ تک جہاں میں رہا
محافظ دول دشت ہائے افریقہ
بڑھے جو آگے شجاعانِ لشکرِ احرار
دکھائی نذر میں شاہوں نے تاج اور تلوار
بڑھے جو آگے تو پھر دوسرے ہوئے پابوس
غرض پہنچ ہی گئے تا حدودِ اوقیانوس
ذرا سی دیر جو سستا کے پھر اُٹھایا قدم
عبور کر ہی لیا بحرِ روم کو یک دم
خدا کے فضل و عنایت سے اب ہوا پورا
وہ خواب جو شہِ ہسپانیہ نے دیکھا تھا
پہاڑیوں سے پرے فاتحوں نے دیکھ لیا
علم صلیبی ہیں اور اسلحہ کا نظارا
"عجب تماشا ہے طارق نے مسکرا کے کہا
خدا کا شکر کہ ہسپانیہ کا ملک ملا"

ضا من کنتوری

بگل کی آواز

اک نور ہے برستا قصروں کے بام و در پر
تقسیم کر رہا ہے خلعت مہ منوّر
ہے فرش چاندنی کا تالاب میں سراسر
ہیں آبشار رقصاں ساز و طرب بجا کر

ہاں اے بگل بجے جا کام اپنا تو کیے جا
گو یہ صدا ہے فانی لیکن صدا دیئے جا

یارو سُنو تو ہے یہ آواز کیسی آتی
پہلے قریب تھی اب ہے دُور ہوتی جاتی
شہنائی دیکھو دیکھو کیا گیت ہے سُناتی
شیریں صدائیں جس کی از بس ہیں دل لُبھاتی

ہاں اے بگل بجے جا کام اپنا تو کیے جا
گو یہ صدا ہے فانی لیکن صدا دیئے جا

یہ عشق کے ترانے ہو جائیں گے فنا سب
ان نعمتوں کے دشمن ہیں ارض اور سما سب
نالوں کو یہ ہمارے سمجھے ہیں جاں فزا سب
پل کر دلوں میں پاتے ہیں دائمی بقا سب

ہاں اے بگل بجے جا کام اپنا تو کیے جا
گو یہ صدا ہے فانی لیکن صدا دیئے جا

رسالہ "زبان" مارچ ۱۹۰۹ء

تمکینؔ کاظمی

رابرٹ ہرک کا خطاب

(اپنی محبوبہ ایتھینیا سے)

تو جو حکم دیدے ظالم، تو فقط تری پرستش کے لئے رہوں میں زندہ
تو جو حکم دے محبت کا تو تیرے سامنے دل، ابھی ڈال دوں گا اپنا
نہ ملے گا جس سے بڑھ کر، کوئی اور نرم و نازک، اور شریف دل کسی جا
تو جو حکم دے ٹھہرنے، میرے بے قرار دل کو، تو رُکے گا وہ اسی دم
اور اگر تو کہہ دے اس کو، کہ گھلے خموشی سے وہ، تو نہ انحراف ہو گا
ترا حکم ہو جو رونے، تو میں روتا ہی رہوں گا، ترے واسطے ہمیشہ
نہ رہیں گی میری آنکھیں تو نہیں ہے مجھ کو پروا، میرا دل رہے گا روتا
اور اگر تو نا امیدی کی، مجھے کرے ہدایت، تو میں تیرا حکم پاکر
بہ ہزار نا امیدی، اسی شاہ بلوط کے پاس، ابھی جا کھڑا رہوں گا
اور اگر جو حکم دیدے، مجھے مرنے کے لئے تو، میری زندگی ہے تو ہی
مری روح میرا دل تو، تجھے اختیار حاصل ہے مری ہر ایک شئے پر
مجھے زندہ رہنے دے یا، کہ مجھے فنا ہی کر دے، وہی کر جو دل میں آئے

"قوسِ قزح"، فروری ۱۹۲۸ء

نریش کمار شاد

آدمیت ہے نور کا چشمہ
پھوٹ کر جو ازل کی وادی سے
میری حسن آفریں نگاہوں میں
بہ رہا ہے ابد کی راہوں میں

اپنے دل کی گھنی خموشی میں
وہ حسیں گیت تھرتھراتا ہے
ماں نے پالا ہے جس کو مر مر کر
اس کسی بچے کے نرم ہونٹوں پر

اک غنی اور فقیر کے مابین
بھوک اک روز ہی کی پیہم بھوک
حدِّ فاصل ہے صرف اتنی سی
تشنگی وہ بھی چند لمحوں کی

دیکھ ہی لو جو دیکھنے کے لئے
نہ ہو تم مجرموں سے بالاتر
تم کو گہری نظر میسر ہو
اور نہ پیغمبروں سے کمتر ہو

بھول سکتا ہے تو بہ آسانی — جو خوشی میں رہا شریک اسے
اور جو رویا ہے تیرے ساتھ مگر — زندگی بھر رہے گا یاد تجھے

بعض اوقات زندگی کے لئے — موت کے گھاٹ بھی اترتا ہے
یعنی اپنی مدافعت کے لئے — آدمی خودکشی بھی کرتا ہے

آدمی ہے وہی حقیقت میں — جو فراست کا اشتہار نہ دے
وہ سمجھتا تو ہو حقیقت کو — لیکن اظہار گاہ، گاہ کرے

امتداد زمانہ کا ہے ظہور! — کوئلے میں نہاں ہے جو ہیرا
اور وہ موتی جو ہے صدف میں ابھی — آئینہ دار ہے سمندر کا

سید سراج الدین علی خاں

فراق

کیا کرے جبرِ مشیت میں بندۂ مجبور
رہینِ وقت مقرر ہے جب بنائے حیات
ہے میری زیست کے لمحوں سے زندگی رنجور
بغیر اذن عبادت نہیں ہے راہِ نجات

غمِ حیات پہ کی ہے نہ سرزنش میں نے
نگاہِ وقت نگر وقفِ انتظار رہی
فراق و فصل کے ہمت شکن مصائب نے
دلایا یاد مجھے تیرا وعدۂ ازلی

خرد کے شک کو مٹانے نہ یوں جسارت کی
کہ وجود تیرا دلیل و بحث سے ہو پیدا
اسی پہ بندۂ مہجور نے قناعت کی
وہ اہلِ قرب کی جنت پہ رشک کرتا رہا
"عجیب سادہ حقیقت ہے عاشقی کا مزاج
دیا ہے جور و جفا کو سپردگی کا خراج"

تغیّرِ زمانہ

ہم نے یہ مانا کہ دنیا ہے پُر از رنج و ملال
اک دن فصلِ بہاری سب کو کر دے گی بحال
صبحِ صادق آئے گی اور آ کے پھیلائے گی نور
فصلِ گُل سے ہوں گے سب وارفتۂ عیش و سرور
پھول گلشن کے بھلا دیں گے غم و رنج و محن
آج جو کرتے ہیں ماتم کل وہ ہوں گے خندہ زن
رنج کیوں کرتے ہیں دنیا میں یہی معمول ہیں
خار کے انبار جو ہیں آج وہ کل پھول ہیں
ہوں مصائب لاکھ دُنیا میں مگر پھر کیا کریں
اس سے کیا حاصل کہ دن بھر رات بھر رویا کریں

ایک ذلّت ہی نہیں دنیا میں عزّت بھی تو ہے
اک مصیبت ہی نہیں دنیا میں راحت بھی تو ہے

صبر اے دل صبر اس رونے سے کچھ حاصل نہیں
اس طرح پر وقت کو کھونے سے کچھ حاصل نہیں

کیا نتیجہ اس قدر رونے سے ہے زار و قطار
ہے مصیبت آج، کل راحت ملے گی بے شمار

باغِ دل میں حسرتیں جو جمع ہیں، بُو کی طرح!
کل بھریں گی چوکڑی صحرا کے آہو کی طرح!

کل یہ ہوگی جانِ شاداں آج ہے جانِ حزیں
ایک حالت پر کبھی دنیا وفا رہتی نہیں

ماہنامہ الناظر، یکم جولائی ۱۹۱۷ء

اے، ایس، رحمٰن

مَیں اور تُو

گر عشق ہو گُل کی صورت   اور میں ہوں برگ مثال
پروان چڑھیں ہم ہمدم   اچھا کہ بُرا ہو موسم
گلزار کہ دشت کی وسعت   ہوں غمگیں یا خوش حال
گر عشق ہو گُل کی صورت   اور میں ہوں برگ مثال

گر عشق ہو لَے نغمے کی   اور میں الفاظ پریشان
اک طرب آمیز صدا سے   مل جائیں لب دونوں کے
پُر کیف ہو بوسہ۔ جیسی   گرما میں شمیم باراں
گر عشق ہو لَے نغمے کی   اور میں الفاظ پریشاں

گر تو ہو جانِ بہاراں — اور میں ہوں والیٔ گلشن
چوپٹ ہو سال و مہ کا — ہوں پھول اور پتے پانسا
تب روز خنک ہو شب سا — اور شب جوں روز ہو روشن
گر تو ہو جانِ بہاراں! — اور میں ہوں والیٔ گلشن

گر میں ہوں دکھ کا راجہ — اور تُو ہو سُکھ کی رانی
ہم کام دیو کو ڈھونڈ نکالیں — پر نوچ کے قید میں ڈالیں
سمجھے ہر ایک اشارہ — منوائیں ہم من مانی
گر میں ہوں دکھ کا راجہ — اور تو ہو سکھ کی رانی

ماہنامہ "رومان" بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۶ء

مہدی علی خاں

محبت

گر مرے حُسن کی خاطر نہ محبّت مجھ سے
اور اگر مرے زر و مال سے اُلفت ہے تجھے

ہیچ ہیں سب مرے انبار زر و دولت کے
مر دِ سکّے مرے ہوں گے ترے قدموں میں پڑے

تو اگر حُسن پہ مرتا ہے تو اُلفت کر لے
صبح کے چہرۂ پر کیف کی تابانی سے

آہ تو میری جوانی سے محبت مت کر
میری پُر جوش جوانی سے ہے گر پیار تجھے

یہی بہتر ہے کہ تو مجھ سے محبت نہ کرے
موسمِ گل کی جوانی کو دل اپنا دے دے

اس سے ارمان نکل جائیں گے تیرے دل کے

اے مری جان تو کر اس لئے اُلفت مجھ سے
کہ مری رُوح کو سچی ہے محبّت تجھ سے

"ہمایوں" مئی ۱۹۳۵ء

حفظ الکریم حفیظؔ

ترانۂ وحدت

یہ چرخ چنبری اور اُس کی وسعتِ موزوں
یہ رنگ نیلوفری اور رفعتِ گردوں
یہ بامِ چرخ کہ جس میں کوئی ستون نہیں
رُکا ہے جو کہ ہوا پر یہ گنبدِ زرّیں
یہ آفتاب کہ جس کو کبھی قیام نہیں
صبح کہیں جو یہ آیا نظر تو شام کہیں
ثبوتِ قدرتِ پروردگار دیتے ہیں
خدا کے ہونے کا سب اشتہار دیتے ہیں

جہاں میں پھیلتے ہیں شام کو سوادِ شام
زبانِ حال سے کہتا ہے ماہِ گردوں مقام

کہ "ہم بھی قدرتِ حق کے عجائبات سے ہیں
فلک پہ پیدا ہویدا اسی کی ذات سے ہیں"

جو گرد چاند کے روشن ہیں تارے سیارے
اُسی کے قول کی تائید کرتے ہیں سارے
قطب سے لے کے قطب تک یہ روز جاتے ہیں
خدا کی ذات کو برحق ہمیں بتاتے ہیں

یہ جب کہ چلتے ہیں ہر شب کو گرم جوشی سے
زمیں کے گرد یہ جب پھرتے ہیں خموشی سے
نہ کہنے دو انھیں اپنی زباں سے اپنا راز
نہ ہونے دو جو نہیں کوئی ظاہری آواز
زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں ترانوں میں
سب اپنا حال حقیقت نیوش کانوں میں
کہ جس نے ہم کو چمک دی وہ ذاتِ باری ہے
اُسی کے ہاتھ کی اک یہ بھی دستکاری ہے

ماہنامہ "ادیب" بابت ماہ ستمبر ۱۹۱۲ء

سفیرؔ

نوائے آوارگی

پھرتے ہیں جنگل جنگل شہروں میں آتے جاتے ہیں
راگ سناتے پھرتے ہیں اور بین بجاتے جاتے ہیں

پوچھو نہ کچھ گھربار ہمارا گھر ہے سارا یہ سنسار
خلقت ساری دوست ہے اپنی اور سب سے ہے ہم کو پیار

گردش دوراں لے جائے جہاں شاکرِ قسمت رہتے ہیں
شہر کی گلیوں میں پھرتے ہیں پچھلے فسانے کہتے ہیں

جنگ و جدل کے قصّے صدیوں کے ہم سے زبانی سن لو
عشق و محبت کی دیرینہ ہر ایک کہانی سُن لو

شہروں میں بھی آتے ہیں پر بن میں ہمیشہ رہتے ہیں
لے جائے جدھر قسمت یعنی رُخ پہ ہوا کے بہتے ہیں

ماہنامہ نقّاد ماہ ستمبر ۱۹۱۴ء

محمد مصطفٰے حسین آصفی

ملکِ عرب

اے مبارک خطۂ صحرا، مقدس سرزمیں
غیر فانی طاقتِ ایماں کے اے عرشِ بریں

اہلِ ایماں پر عیاں ہے عظمت و اجلالِ حق
تیرا باطن حق سے مالا مال، ظاہر لق و دق

چھوڑ کر زرخیز دوآبے جنھیں گھیرے ہوئے
نرم رو دریا کی باہیں اپنے حلقے میں لئے

وہ ممالک جن پہ ہر دم آسماں ہے مہرباں
فیض بارش سے زمیں ہو جاتی ہے جنّت نشاں

چھوڑ کر ملکِ ملایا کے گلستان و بہار
وادیِ کشمیر سے سرسبز باغ و مرغزار

جمع ہوتے ہیں زیارت کو ترے اے سرزمیں
تو دلاتی ہے انھیں وہ شئے جو دنیا میں نہیں

لے کے پاکیزہ اُمنگیں آئے ہیں اے سرزمیں
مانگتے تجھ سے نہیں وہ جنس جو تیری نہیں

سحرِ برفستانِ کوہ آلپس یاں پیدا نہیں
رہائن کے جادو خرامی کے بھی یہ شیدا نہیں

ان ممالک سے جہاں ہیں رُوح کی بربادیاں
عارضی شہرت سیہ کاری کو ہوتی ہے جہاں

ہے جہاں جنگی مشینوں پر گھمنڈ انسان کو
دیکھتے ہیں دیدۂ تحقیر سے ادیان کو

یہ یہاں آئے نہیں اس تندرستی کے لئے
جو میسّر آسکے آب و ہوا کے فیض سے

اور نہ اس دولت کی خاطر جو کہ گنجینے میں ہے
چاہتے ہیں وہ جو تیرے لَق ودق سینے میں ہے

آئے ہیں لینے وہ جو حق نے تجھے کی ہے عطا
جس کا حامل کوئی خطّہ بھی نہیں تیرے سوا

یعنے وہ انوار کر دیں رُوح کو جو مشتعل
اور وہ آتش کہ جس کی جائے پیدائش ہے دل

ہاں بہت دیکھے ممالک خوش سواد و جانفزا
رُوح کو ملتا ہے جن سے عیشِ فانی کا مزا

کس قدر ایماں فزا ہے پر ترا حُسن وجمال
رُوح پرَور ہے ترے مہر و تمازت کا جلال

محو دل سے ہو چکے سارے مناظرِ دیدہ زیب
سحرِ باطل کی طرح ٹوٹا طلسم دل فریب

اے خوشا صحرا ترے رنگ و جبالِ خشمگیں
تیرے نظارے سے پھر آنکھیں مری روشن ہوئیں

مخمورؔ

ایک محوِ خواب

نوکِ مژہ پہ تیری میری نظر ہے اس دم — تیرا دماغ خفتہ ہے محوِ خواب پیہم
اور جائے آمد و شد خوابوں نے ہے بنایا

ہاں! صبحِ سیمتن کی تحریم کی غرض سے — حرمین منظری کو اب باز جلد کر دے
اور دیکھ لے وہ جلوہ جو حق نے ہے دکھایا

ایک نُور کی لہر نے دوشیزہ روشنی کی — موجِ پُر از خطر کو پُرخواب تیرگی کی
عرصہ ہوا کہ سطحِ عالم سے ہے ہٹایا

گو خوش گلو لوے کو سُنتی ہے چہچہاتا — اُٹھنے کا خیال دل میں تیرے نہیں ہے آتا
اور رات کو ہے تو نے اے بے خبر بڑھایا

حُوریں جھکی کھڑی ہیں فردوس کی فضا پر — اور عالمِ سکوت زنگار گوں میں ہو کر
نظریں جھکی ہیں نیچے، یوں تُو نے دل لُبھایا

ماہنامہ نقّاد، ستمبر ۱۹۱۷ء

احسن اکبرآبادی

محبّت اور میرا درس

کبھی حاصل تھا مجھے اپنی ذکاوت سے یہ فوق
درجہ چڑھنا نہ تھا دشوار ذرا بھی مجھ کو
مگر اب کہتے ہیں سب لوگ کہ ہوں میں بدشوق
پاس ہونے کی ہے مشکل سے توقع جس کو

اک تغیّر! کہ چلا جب سے تمہارا اک وار
کیفیت رہتی ہے اس طعنہ خوری کی اکثر
ہے وہی قصّۂ پارینہ۔ "تلاشِ زن دار"
تم بسی رہتی ہو ہر دم مرے دل کے اندر

فخریہ یاد ہیں مجھ کو وہ گذشتہ ایّام
اپنی محنت کا نہ تھا جب کہ کوئی حد و حساب

میرے استاد بھی انگشت بدنداں تھے تمام
دیکھ کر ذہن رسا اور مرے برجستہ جواب

لیکن اس درجہ نظر آتا ہوں اب میں مجہول
کہ خدا جانے جماعت میں چلوں گا کیونکر

جز تصوّر، نہیں کچھ اور اب اپنا معمول
جب سے اے جان تمہارا ہوا اس سمت گذر

ہو کے آمادۂ محنت کبھی کرتا ہوں میں وا
میز پر رکھ کے، کتابوں کو، جواب اپنے قریں

دل یہ کہتا ہے کہ یہ کام ہے ہمت سے سوا
اک سطر بھی نہیں ہوتی ہے مرے ذہن نشیں

چاہتا ہوں کہ پڑھوں! کاش یہ ممکن ہوتا!
بے اثر رہتی ہیں اوراق پہ نظریں جم کر

کیونکہ استادہ ہیں حرفوں کی قطاریں جس جا
میں سمجھتا ہوں، وہاں تم مجھے آتی ہو نظر

حکم ہوتا ہے، کہ مضمون مجھے لکھنا ہے
سُن کے یہ ہاتھ میں لے لیتا ہوں میں اپنا قلم

پر یونہی وقت مقرر بھی گذر جاتا ہے
ختم کا گھنٹہ جو بجتا ہے تو میں بس اس دم

سادہ کاغذ پہ نظر کرتا ہوں جب باعجلت
چاک کرتا ہوں اسے شرم کے مارے جھک کر
کیونکہ صفحہ پہ مری جاں، بہ زیب و زینت!
خندہ زن تم، ہنسکھ مجھے آتی ہو نظر!

کرتے ہیں مجھ کو زبس پند و نصائح اُستاد،
اور کہتے ہیں" ہو جاتے ہو تم کیوں احمق!
ہوں! اگر علم کے سب ان کو مسائل ہیں یاد
راز کیوپڈ کا نہیں جانتے لیکن مطلق!
ہے یہ اصرار" پڑھائی کی طرف دھیان کرو
ورنہ ہشیار کہ اچھا نہیں ہے اس کا اثر"
کچھ سمجھتے نہیں یہ لوگ! ہے حیرت مجھ کو
حال اس دل کا جہاں تم نے بنایا ہے گھر

کہتے ہیں، آہ! رہیں بے رحم نگاہیں کیسی!
جو بناتی ہیں مری نظروں میں ان کو نیرو[1]

کہ کتابوں سے رہی گر یہی غفلت میری
امتحانوں میں ملے گا مجھے صرف اک زیرو[2]

وہ سمجھتے ہیں کہ میں شرم سے مر جاؤں گا
مجھ کو ذرہ کے برابر نہیں پرواہ مگر،
چوکھٹا بیضوی سا اک اسے میں سمجھوں گا
اور تصویر لگاؤں گا تمہاری اُس پر

ماہنامہ "نقاد" بابت اکتوبر ۱۹۱۷ء

---

[1] نیرو، سلطنت روما کا ایک سفاک بادشاہ گذرا ہے جس کی بے رحمی ضرب المثل ہے
لاکھوں آدمیوں کو اپنے سامنے تہ تیغ کروا دیا۔

[2] "زیرو" انگریزی میں صفر کو کہتے ہیں۔

ولی احمد خاں (جے پور)

پاسِ محبت

گرچہ ہر دل میں ہوا کرتی ہے شہرت کی طلب
لیکن اس کا نہ مجھے شوق نہ اس سے مطلب

باغ شہرت کے لگانے کو ہیں ایام شباب
جس میں سب طرح کے ہوتے ہیں مہیا اسباب

جب جوانی ہی میں ثمرہ نہ ملا شہرت کا
وقت پیری جو ملا بھی تو ہے پھر فائدہ کیا

گل پژمردہ پہ کرتی نہیں شبنم تاثیر
گرچہ غنچے کے لئے ایسی ہے جیسے اکسیر

تجھ کو اے شہرۂ آفاق! کروں کیا لے کر
دل میں باقی نہیں اب میرے ہو اے دلبر

تھا جو شہرت کا طلب گار تو مقصود یہ تھا
کہ پہونچ جائے کسی طرح وہاں تک چرچا
تاکہ شہرت کو مری سن کے وہ مسرور بھی ہو
اس کی محفل میں مرے شوق کا مذکور بھی ہو
میری شہرت بھی خوشی میں ہے اسی کی پنہاں
حالتِ زار مری جس کو ہے مدت سے عیاں
اُس کی آنکھوں میں نہاں ہے مرا رازِ شہرت
وہی قدسی مری وحدت ہے وہی ہے کثرت
اس کی درگاہ میں مقبول مری اُلفت ہو
یہ اگر ہو تو نہ پھر اور کوئی حسرت ہو

ماہنامہ الناظر، ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۴ء

ا، ع ثرر کاکوروی

گرمیِ عشق

ایک دن فصلِ زمستاں میں ہوئے گھر سے رواں
کھیلنے کے واسطے ہمراہ تھا وہ جانِ جاں
یخ کے ریزے گر رہے تھے آسمانِ سرد سے
رنگ بھورا چرخ کا ملتا تھا کچھ کچھ گرد سے
ریزہ ہائے برف کی رفتار میں تیزی نہ تھی
گر رہے تھے متصل لیکن نہ یہ حالت کھُلی

عمر میں تھا پر مُسِن، لیکن محبت میں جواں
عشق کی گرمی سے تھا دل مرا سینے میں طپاں
نوجوانی میں یہ حالت تھی مرے دلدار کی
سرد مہری تھی سراسر گرم جوشی کچھ نہ تھی

میں نے چاہا گرم جوشی کچھ ہو فصلِ برد میں
چھو کے دیکھوں لطف کیا ہے اس کے دستِ سرد میں

اس سے یہ میں نے کہا اے جانِ عاشق مہ جبیں
کوئی تجھ کو دیکھ کر شیدا نہ ہو ممکن نہیں

سرد مہر و سنگ دل واللہ تو ہے بے گماں
دل ہے پتھر بے اثر ہے سرد مثلِ آسماں

آسمان و دل میں بھر دوں یہ مری خواہش ہوئی
ایک گھنٹے کی ملے گرمی جو فصلِ گرم کی

اس سے یہ مطلب کہ ساری سرد مہری دُور ہو
جتنا صدمہ ہے مرے دل میں وہ سب کافور ہو

یہ کہا میں نے کہ اس کی ہے نہایت احتیاج
آسماں سے برف کا ریزہ جو یہ گرتا ہے آج

اس کو رکھ دوں میں اٹھا کر اک تماشا ہو عیاں
تیرے سینے پر کہ جس میں سرد مہری ہے نہاں!

گھُل کے پانی ہو یہ تیرا دل پسیجے نرم ہو
عشق کی گرمی سے میرے دل کی صُورت گرم ہو

ہو مجھے امید میں سمجھوں کہ تو ہے مہرباں
سرد مہری اب نہیں تجھ میں مثالِ آسماں

آہ سب بیکار تھا جو کچھ کیا میں نے خیال
اشتیاق و حسرت و امید سب تھے پائمال

برف کا ریزہ نہ ٹھیرا اور نہ وہ گل کر بہا
فرق جسم و برف کا ہم پر نہ کچھ ظاہر ہوا

ماہنامہ الناظر، یکم ڈسمبر ۱۹۱۳ء

محمد یوسف قیصرؔ

دوست کی یاد

مرا مکان جو جنگل کے ہے کنارے پر
وہاں کھڑا ہے بہت ہی پرانا ایک شجر
جھکا ہوا ہے وہ پیرِ ضعیف کی صورت
ہے سبز پتیوں میں اس کی اک نئی رنگت
جب اس پہ بیٹھ کے بلبل لگاتی ہے تانیں
تو دلکشی سے وہ جنگل میں گونج جاتی ہیں
تو اپنی زمزمہ سنجی نہ ختم کر بلبل
تو میرے دوست کی رکھتی ہے کچھ خبر بلبل
سُنا تو، کیا وہ مجھے یوں ہی یاد کرتا ہے
وہ کس طرح سے طبیعت کو شاد کرتا ہے

اسی جگہ کبھی ہم دونوں ساتھ بیٹھے تھے
سریلے راگ ترے کس خوشی سے سُنتے تھے
مناسبت سے ہم آپس میں شوخیاں کر کے
سرور میں تھے طبیعت کو شادماں کر کے
معاہدہ یہ ہوا تھا کہ دونوں شاد رہیں
کسی طرح نہ ہم ایک دوسرے سے چھٹیں
خبر نہیں کہ مرا دوست ہے کہاں آباد
وہ کس سے دوستی کر کے ہوا ہے یوں دل شاد
بتا تو، تو نے اگر اس کو ہے کہیں دیکھا!
محال ہے کہ اسے آج تک نہیں دیکھا
کسی قریب کے قصبے میں اس کو دیکھا ہو،
تو اتنا کہہ دے، محبّت بھی مجھ سے ہے اس کو

غلط ہے اس کو محبّت کسی سے ہو جائے
غلط ہے یاد کسی کی وہ دھیان میں لائے
جھکے گا سر نہ کبھی اس کا اور کے آگے
محال ہے کہ وہ ہاتھ اپنا اور ہاتھ میں دے

مجھے یقین ہے، اور حشر تک رہے گا یقین
کہ اس کو میرے علاوہ کسی کی یاد نہیں
مگر یہ تیری غم آلود تان تو مجھ پر
چلا رہی ہے بہت طعن و طنز کے خنجر
مرے عقیدۂ الفت سے کر نہ بیدردی
صدائے طعن سے اپنے نہ کر اسے زخمی
نہ کر ہنسی، تو بتا دے جو تو نے دیکھا ہے
وہ کس دیار محبت میں جا کے رہتا ہے
یہ کہہ تو، کیا ہے وہ مجھ کم نصیب سے بیزار
وہ کس دیار محبت میں جا کے رہتا ہے
یہ کہہ تو، کیا ہے وہ مجھ کم نصیب سے بیزار
یہ کہہ تو، اور کی الفت میں کیا ہے وہ سرشار

جو اس نے مجھ کو دغا دی، قسم کو بھول گیا
محبت اور کسی دوسرے سے کرنے لگا
تو ایسی تان لگا کر ستا نہ دل میرا
اب اور اس سے زیادہ، دکھا نہ دل میرا

کسی خوشی میں کہ ماتم میں جاؤ تم دونوں
مری بلا سے جہنم میں جاؤ تم دونوں

پھر اس کی زمزمہ سنجی بطور شکوہ تھی
وہ تھوڑی دیر میں اڑتی ہوئی نظر آئی
اکیلا رہ گیا بیٹھا ہوا وہیں پر میں
بغیر نغمۂ الفت کے تھا دہیں پر میں

ماہنامہ "الناظر" لکھنؤ، اگست سنہ ۱۹۱۶ء

احسن اکبر آبادی

مرنے والے کی رُوح

(۱)

کہہ مجھ سے! رُوح اس کی جس بُت کا ہوں میں شیدا
کہہ دے یہ آہ، مجھ سے! تو کِس جگہ چھپی ہے
عالم ہے کوئی بالا، دلکش ہے کوئی دنیا؟
اے شاد کام مُردے! جو تجھ کو مل گئی ہے

یا یوں ہی پھر رہی ہے آزاد اور شاداں
یہ فکر ہے کہ اپنے عاشق کا غم بٹاؤں!
آ دیکھ لے، پڑا ہے تجھ بن مکان ویراں!
افسوس! اس میں رہ کر اب لطف کیا اٹھاؤں؟

سب تیری سیر گاہیں، جتنی ہیں میری راہیں
جب ہر شجر کے نیچے، پا کر میں آہ! ہر سو

سایہ ترا خیالی، کرتا ہوں اس سے باتیں
میرا ہر ایک آنسو ہوتا ہے تجھ سے مملو

تھم جائیں اشک جس دم تھک جائے چشمِ پُرنم
دل سوز کوئی دریا، آغوش اُس کا پاکر

جب نیند کے سبب سے غم اس طرح ہو کچھ کم
تسکین دینا پیاری، رویا میں مجھ کو آکر

(۲)

بتلادے، روح ہے مرے دلبر کی تو ضرور
بتلادے، آہ! راہ یہ تو نے کدھر کی لی؟

تجھ کو ملا ہے عالمِ بالا میں کیا سرور؟
اے مرنے والے! تیری تو تقدیر کھل گئی!

تو پھر رہی ہے خرّم و آزاد کس لیے؟
اک دن تو آکے عاشقِ مضطر کا غم بٹائے

جس گھر سے عیش و راحت و آرام چلا جائے
تیرے بغیر، اُس میں، وہ کس طرح چین پائے

منڈلاتی ہے جو راہ میں تو میرے چار سو
اور جب ہر ایک درخت کے نیچے کھڑا ہوا
کرتا ہوں تیرے سایۂ فرضی سے گفتگو
آنسو ہر ایک، ہوتا ہے تجھ سے بھرا ہوا

غم دیدہ آنکھ تھک کے کبھی بے خبر سی ہو
اور دردمند، جب ہو لب جو کوئی مرا،
تخفیف غم، جو نیند میں یوں مختصر سی ہو
دلگیر چہرہ خواب میں آئے نظر ترا

ماہنامہ "نقاد" ماہ اگست سنہ ۱۹۱۴ء

وفاؔ

تنہائی

آج کیا جو بن پہ ہے فصلِ بہار
ہے عجب دلکش درختوں کا نکھار
ہے کہیں بیلا چنبیلی کی قطار
سرخ ہے مارے خوشی کے کیا انار

نرگس و شمشاد و سوسن یاسمن
بلبل و قمری کہیں ہیں خندہ زن

قدرتی ہے فرش مخمل کا بچھا
ہے عجب پر لطف سبزے کی فضا
کیاریاں ہیں کس غضب کی خوشنما
بہ رہا ہے جن میں پانی جابجا

نعرہ زن ہیں قمریاں حق سرہٗ
ناچتے ہیں مور کیا کیا چار سو

دیکھتے ہیں ہم یہ دریا کی بہار
چاندنی کی شب یہ موجیں آبدار
ہیں ستارے آب پر گویا شرار
ولولے اُٹھے ہوا دل بے قرار

حسرتیں بن کر اٹھیں موجیں اِدھر
یاس اور امیدوں کا ہنگامہ اُدھر

ہے یہ سب کچھ پر نہیں اتنا کوئی
آ کے پہونچا دے خبر مجھ کو تری
ہے صبا کو کیا غرض اس کی پڑی
کیوں کسی کی وہ کرے نامہ بری

کس طرح ہو میری آہوں کا اثر
کیوں ستارے دیں مجھے اس کی خبر

کچھ نہیں معلوم مجھ کو تیرا حال
تو کہاں ہے، ہے یہ ہر لحظہ خیال
کب وہ آئے گی گھڑی دن نیک سال
جب تجھے دیکھیں گے ہم اے خوش جمال

اے وفاؔ ہے فرقتِ جاناں غضب

ماہنامہ "الناظر" یکم فروری ۱۹۱۳ء

باسطؔ بسوانی

حُبِّ وطن

فخرِ عالم ہے جہاں میں بیگماں اک سر زمیں
جس کو کہئے مرکزِ افضال رب العالمین

دن کو ہو مہر منور جس جگہ جلوہ کناں
رات کو جنت بنائے جس کو ماہِ ضو فشاں

کیا کہوں ہے کیسی پیاری دلکشا وہ سر زمیں
صادق و نیک و جری بستے ہیں واں مہ رو حسیں

تجربہ کارانِ عالم اور جہاں دیدہ تمام
نوجوانانِ محبت کیش، بے دل، نیک نام

ہائے وہ ملاح بھی جو گھومتا ہے بے خطر
ڈھونڈلے جو وہ جزیرے جن میں نکلے سیم و زر

جو اسی کوشش میں ساری عمر سر مارا کرے
ساحلِ دلکش کا جو ہر وقت نظارہ کرے

ملک ایسا فیض بخش و رشکِ فردوسِ بریں
چار سو عالم میں گھوما، اس نے بھی دیکھا نہیں

دیکھنے کو دیکھ آیا سینکڑوں دلکش دیار
ہے مگر کچھ اور ہی اس کی ہوائے خوش گوار

دشتِ غربت میں بھی سچ پوچھو تو اس کا مرغِ روح
جبر سے حبس پر نہیں ممکن اسے ہرگز فتوح

یاد سے رہ رہ کے ہو جاتا ہے ایسا بے قرار
رخ سدا اس قبلہ کی جانب کرے بے اختیار

کیونکہ ایسی سرزمیں میں جس پہ ہے فضلِ خدا
جو وراثت ہے شریف النسل کی بھی بر ملا

اک جگہ ہے ایسی پیاری اور ایسی انتخاب
ڈھونڈنے سے جس کا عالم میں نہیں ملتا جواب

جس جگہ انسان جو خلقاً مجسّم جور ہے
یوں بدل جاتا ہے بیشک، تم کہو کچھ اور ہے

پھینک دیتا ہے وہ خنجر۔ جبر بھی کرتا نہیں
ڈال دیتا ہے عصا اور فخر بھی کرتا نہیں

اور اسی کی یوں نگاہِ لطف کا اظہار ہے
شوہر دلدادہ ہے۔ بھائی کسی کا یار ہے
مہرباں ہے ہر طرح سے واں کسی کا باپ ہے
رُوبرو اپنے پدر کے پھر بھی لڑکا آپ ہے

صنفِ نازک سچ جو پوچھو اس جگہ ہے حکمراں
دلربا بیوی بھی، دختر اور سب سے پیاری ماں
بادۂ عشرت سے ہر اک کیوں نہ یاں مدہوش ہو
تنگ راہِ زندگی جب اس طرح گل پوش ہو
رشکِ جنّت اس کی چشمِ مست کی کس کو خبر
چلتا پھرتا اک فرشتہ جس میں آتا ہے نظر
ہائے جو جنسِ محبّت کی نگہبانی کرے
روز خوش بختوں پہ نازل فضلِ یزدانی کرے
صنفِ نازک ہی کے دم سے خانگی سب کام ہوں
عشرتیں جتنی ہیں گھر کی ہر طرح سے رام ہوں

ہاں ملے گی کس جگہ وہ رشکِ جنّت سرزمیں؟
ہاں کہاں سے ہاتھ آئے گی وہ جائے دل نشیں؟

کیا تو انساں ہے تجھے حاصل ہے کیا ایسا شرف؟
ہے تجھے حبِ وطن؟ تو دیکھ لے چاروں طرف
گھومنا تیرا عبث، باسط سے پوچھ اس کا نشاں
وہ زمیں ہے ملک تیرا۔ وہ جگہ تیرا مکاں!

ماہنامہ "ترجمان"، اگست ۱۹۱۷ء

محشر عابدی

نغمۂ محبّت

میرے پاس آ، میرے دل میں سما جا، اے مری دنیا
اٹھائیں زندگی کے لطف ہم ہو کر بہم یک جا
جو پنہاں کوہساروں میں ہیں اور شفاف چشموں میں
جو مخفی وادیوں میں اور ہیں سرسبز کھیتوں میں
پہاڑوں کی چٹانوں پر بھی ہم پھر جا کے بیٹھیں گے
وہاں سے بھیڑ، بکری اور چرواہوں کو دیکھیں گے
جو پھرتے ہیں کنارے ندیوں اور آبشاروں کے
جہاں خوش رنگ طائر نغمہ ہائے عشق ہیں گاتے
وہاں تیرے لئے پھولوں کے میں گجرے بناؤں گا
تجھے ہر رنگ کی کلیوں کے گہنوں سے سجاؤں گا

ترے سر پر رکھوں گا تاج ایک گلہائے سیمیں کا
بناؤں گا ترا جامہ بھی میں اوراقِ رنگیں کا
گڈرئیے کمسن ہر صبح بہار آئیں گے بہلانے
ہنسانے اور ہنسنے شور کرنے، ناچنے، گانے
دلِ نازک کو تیرے گر یہ سب باتیں پسند آئیں
تو آجا، ہم بھی مل کر نغمۂ اُلفت میں کھو جائیں

سالنامہ "سروش" لاہور، جنوری ۱۹۳۰ء

باقیؔ امروہوی

ہمدردی

گردشِ افلاک سے تھا مبتلائے درد و غم
بیکسی کو میری اک مردِ خدا نے بھی سُنا
چپکے سے آیا وہ میرے پاس مردِ نیک خو
جیب میں سے کچھ نکالا اور مجھ کو دے دیا
کی نہ اُس نے گفتگو میری تسلّی کے لئے
اور نہ مجھ سے مہربانی کا کوئی فقرہ کہا
رفتہ رفتہ ہو گئی حالت مری جیسی کہ تھی
حبّہ حبّہ اس کا میں نے جتنا تھا سب دے دیا
شکریہ میں میرے کھولی اس نے تب اپنی زبان
اور اپنے جود و ہمّت کو دُعا دینے لگا
دوسرے سال اتفاقاً ہو گیا بیمار میں
اپنے جینے کا رہا مجھ کو نہ کوئی آسرا

تھا نہ مرے پاس کوئی مونس و ہمدم رفیق
ہو گیا افلاس میں اس کے سوا میں مبتلا

راستے سے میرے اک گذرا وہاں مردِ غریب
میرے حالِ زار پر افسوس وہ کرنے لگا

مجھ کو کھانے کو دیا مجھ کو پہننے کو دیا
رات دن تیمار داری میں مری مصروف تھا

ہم نے یہ مانا کہ زر دنیا میں بیشک ہے عزیز
شکر اس کی مہربانی کا کروں کیونکر ادا

کچھ نہیں بڑھ کر یہاں ہمدردیٔ انساں سے
ملتی ہے احسان کی بس روزِ محشر ہی جزا

ماہنامہ "ترجمان"، مئی و جون ۱۹۱۷ء

رشید احمد ارشدؔ تھانوی

ننّھا منشی

اے ذرا سی جان! اے پانی کے ننّھے جانور
اے سکوں سے بھاگنے والے! رہینِ اضطراب
کیا لکھا کرتا ہے تو۔ لہروں کی ہر اک سطر پر؟
کس لئے حرکت کیا کرتا ہے تو بالائے آب؟

باوجودیکہ نہ ٹانگیں ہیں نہ بازو ہیں ترے
کس قدر تیزی سے لیکن دوڑتا رہتا ہے تو
چشمِ بینا گو نہیں قدرت نے بخشی ہے تجھے
پھر بھی اپنے راستوں کو جانتا ہے چارسو

مجکو! لیکن یہ تو بتلا دے کہ ہے کیا چیزِ تو؟
پہلے کیا تھا؟ کس جگہ تھا؟ اور کیا ہونے کو ہے
سیکھ کر آیا ہے کس سے اس قدر تمیزُ تو؟
اے درخشاں "ننھی ہستی" محو لکھنے میں جو ہے

برقِ رفتاری یہ تیری چشمۂ شفّاف پر
اپنی سرعت سے نہیں دیتی ہے جنبش آب کو
اور اگر ہوتی ہے کچھ جنبش بھی سطحِ صاف پر
تو چلی گویا صبا گلزار میں آداب کو

اے ذرا سے جانور ہاں تو اکیلا تو نہیں
بیسیوں ہیں ننّھی ننّھی ہستیاں تعداد میں
کچھ شمار اپنا بتاؤ تم نے لکھا تو نہیں
کس قدر تم آئے ہو اس عالمِ ایجاد میں؟

"ادیب" مارچ ۱۹۱۳ء

سید محمد اکبر وفا قانی

سُہاگن کا راگ

او میرے لڑنے والے کنیا
مجھ سے جھگڑنے والے کنیا

یوں مجھ سے انجان نہ ہو جا
بے دل کا انسان نہ ہو جا

مجھ سے نہ لڑ میں ہوں البیلی
تیرے گھر میں نئی نویلی

مجھ لاچار سے اَڑنا کیسا
بے ہتیار سے لڑنا کیسا

جس کی ہوں وہ مجھ سے خفا کیوں
اپنوں میں شکوہ و گلا کیوں

کوئل ہوں میں تیرے بَن کی
جوگن ہوں میں من موہن کی

بے کس کی آواز یہی ہے
بے پر کی پرواز یہی ہے

تو ہے راجہ میں ہوں داسی
میں ہوں تیرے عشق کی پیاسی

وہ جادو گر جادو کر لے
وہ افسوں گر افسوں پڑھ لے

بن کے اُلفت دے دلداری — بَن کے محبّت دے بیداری
بن کے خدا اب بندہ کرلے — بن کے مسیحا زندہ کرلے
مالک میرا ناتھ تو ہی ہے — دکھ مشکل میں ساتھ تو ہی ہے
مجھ کو تو من باسی کرلے — میری رُوح کو داسی کرلے
روتی ہوں میں تیرے دکھ پر — خوش ہوتی ہوں تیرے سُکھ پر
یہ جو کبھی ہوں رُوٹھ کے روتی — مفت کے غم میں جان کو کھوتی
ہے یہ فقط میری نادانی — میں نے تیری قدر نہ جانی

میں جو کچھ ہوں سو ہوں تیری
اُلفت تیری قسمت تیری

مجلہ مکتبہ، مکتبہ ابواہیمیہ، مئی ۱۹۲۸ء

حافظ محمد یعقوب اوج گیاوی

خوشی

اے خوشی اے مایۂ عیش و نشاط — ہے تری دلکش بہارِ انبساط
تیرا آنا بھی مسرّت خیز ہے — ہر ادا تیری نشاط انگیز ہے

تو بہارِ بے خزاں ہے اے خوشی — یا گُلِ باغِ جناں ہے اے خوشی
تو ہے کوئی حور ہے یا مہ جبیں — یا مئے گلگوں کا جامِ آتشیں

کس قدر دلکش ترا انداز ہے — جو ادا تیری ہے اک اعجاز ہے
غنچۂ دل تیرے آنے سے کھِلا — تو ہے بے شک غیرتِ موجِ صبا

آہ لیکن کچھ نہیں تجھ میں ثبات — ہستیٔ فانی ہے تیری کائنات
بزمِ عالم میں ہے تو مثلِ سُراب — بحرِ ہستی میں ہے مانندِ حباب

چند لمحے کے لئے تو آئی تھی
آہ! اے میری مسرّت کی گھڑی

کچھ نہیں تیرا بھروسہ کچھ نہیں
جا۔ چلی جا۔ اب تمنّا کچھ نہیں

میں سمجھتا تھا کہ تو ہے پائیدار
تیری ہستی ہے جہاں میں یادگار،

تجھ سے حاصل ہوں گے عشرت کے مزے
چین سے لوٹوں گا راحت کے مزے

کیا خبر تھی یہ کہ تو معدوم ہے
تیری ہستی، ہستیٔ معدوم ہے

آہ! تجھ سے تو ہے بہتر غم مرا
جا۔ ترے بدلے ہے یہ ہمدم مرا

"ادیب" مئی ۱۹۱۳ء

منوّر لکھنوی

راز و نیاز

ہوں اسیرِ جنونِ فتنہ ساز
مجھ سے کہہ دو تم اپنے دل کا راز

مجھ سے کیوں حالِ دل چھپاتے ہو
مجھے مایوس کیوں بناتے ہو

نہ رکھو اس کو اس قدر مستور
راز کہہ کر مجھے کرو مسرور

آؤ، تم آ کے بیٹھو میرے پاس
کہ نہیں غیر کی یہاں بُو باس

ہوں اسیرِ جنونِ فتنہ ساز
مجھ سے کہہ دو تم اپنے دل کا راز

تم جو چپکے سے مسکراتے ہو
برق دل پر مرے گراتے ہو

آہ! سرگوشیوں سے لے کر کام
حالِ دل اپنا مجھ سے کہہ دو تمام

کیفیت طرفہ آج شب کی ہے
تیرگی کس قدر غضب کی ہے

خامشی ہر طرف جہاں میں ہے
ایک سناٹا سا مکاں میں ہے

ہیں طیورِ چمن بھی مہر بلب
آشیانوں میں محوِ خواب ہیں سب

ڈبڈباتے ہوئے جو آنسو ہوں
دل دکھاتے ہوئے جو آنسو ہوں

دل مسلتا ہوا تبسّم ہو
جو اچھلتا ہوا تبسّم ہو

میٹھا میٹھا جو درد ہوتا ہو
رنگِ رخ جس سے زرد ہوتا ہو

اور شرم و حیا جو دلکش ہو
اور ناز و ادا جو دلکش ہو

راز کہہ دو ذریعے سے ان کے
ہیں وسیلے یہ کشفِ باطن کے

ہوں اسیرِ جنونِ فتنہ ساز
مجھ سے کہہ دو تم اپنے دل کا راز

"زمانہ" اپریل ۱۹۲۶ء

سفیرؔ

گڈریے کا راگ

جون کا پیارا دلکش موسم
صبح کا وقت فضا کا عالم
اک گڈریے کا لڑکا
میٹھے سروں میں بنسی بجاتا
وادی و صحرا دشت و جبل کو
بھونروں کو زنبورِ عسل کو
چڑیوں کو اور ہوا کو سُنا کر
پڑھتا تھا یہ نغمہ گا کر

مطلع صاف ہوا شفاف

مہکی ہوئی نسرین و سمن سے
آتی ہے بھینی بھینی چمن سے

آؤ چڑیو ، آؤ چڑیو ،

چہکو شور مچاؤ چڑیو !
مل جل کر سب گاؤ چڑیو
پیارا نغمہ اپنی زباں کا
پیارا نغمہ عیش جہاں کا

آہا کیسی زندگی اچھی

دشت وجبل اور صحرا میں   جنگل کی دلچسپ فضا میں
ناچو کودو، دُھوم مچاؤ
ہو اس شور سے مل کر پیدا   عیش جہاں کا دلکش نغمہ
پیارا نغمہ اپنی زباں کا   پیارا نغمہ عیش جہاں کا
صبح جوانی، شام جوانی
کیسے بھلے ایّامِ جوانی   گا کے کٹے ہنگامِ جوانی
آؤ ہواؤ، آؤ ہواؤ
سن سن چل کر شور مچاؤ   گاتے ہیں ہم، آواز ملاؤ
پیارا نغمہ اپنی زباں کا   پیارا نغمہ عیش جہاں کا
عشق و محبّت ہے اک دولت
یعنی نزولِ رحمتِ باری   تم کو ہم کو سب کو پیاری
پس سب گاؤ، دُھوم مچاؤ
گونجے عرش اور دنیا ساری   ہو اب ہم آہنگ ہماری
پیارا نغمہ اپنی زباں کا   پیارا نغمہ عیش جہاں کا

"زمانہ" اگست وستمبر ۱۹۱۱ء

سید محمد اکبر وفا قانی

تو ایسے سماں میں آ پیاری

(۱)

او! موہن مورت باہر آ
او! رشکِ قمر او! ماہِ لقا
تو دن سے بڑھ کر روشن ہے
تو چاند سے بڑھ کر کندن ہے
تو شام کی سندر پیاری ہے
تو وقتِ سحر کی دیوی ہے
جب طفلکِ سالِ نو کے لئے
دیتی ہو بادِ سحر کے جھونکے
ہو وقت خوشی کا موسمِ گل
رو لیتی ہو جس میں بلبل
تو ایسے سماں میں آ پیاری
اور آ کر مجھ کو رلا پیاری

(۲)

شاید یہ سماں پیدا کر دے
پھر موسمِ گل کے سے چرچے
لہروں میں تلاطم پیدا ہو
دریا میں تبسّم پیدا ہو
سب چشمے موسیقار بنیں
سب کوہ رباب کے تار بنیں
پھر کیوں نہ خزاں گلشن بن جائے
جب تیری ہنسی مجھ کو یاد آئے

(۳)

دُور، اس دنیا کی بستی سے کلفت کی اوج اور پستی سے
ہم کوہ و دشت میں جائیں گے جنگل کی ہوائیں کھائیں گے
ایک وجد سکونِ قلب سے ہو پابندی کوئی نہ ہو دل کو
جس جا قدرت کا ہر ذرّہ ہو حُسن کے نغمے میں ڈوبا

(۴)

او! نُورِ سحر! خورشید لقا اب خواب سے اُٹھ اور باہر آ
آ نہروں کے نظاروں پر آ قدرت کے فواروں پر
پتّوں کے جھرمٹ میں آجا پھُولوں کے گھونگھٹ میں آجا

مجلہ مکتبہ، جولائی ۱۹۲۸ء

حامد علی خاں

ایک قبر کا کتبہ

مسافر! ٹھہر، ڈال جا اک نظر
ادھر، میری محبوبہ کی قبر پر

مری غم نصیبی پہ رو جا ذرا
جو تو دردِ اُلفت سے ہے بہرہ ور

اگر عشق سے دل ہے خالی ترا
کبھی تو نے اُلفت نہیں کی اگر

تو افسوس! افسوس اے بدنصیب
پھر آ! خود میں روؤں ترے حال پر

"ہمایوں" اپریل سنہ ۱۹۴۲ء

منصور احمد

وہ سو رہی ہے

میں جانتی نہیں ہوں اے زندگی تو کیا ہے
لیکن یہ جانتی ہوں وہ دن بھی آرہا ہے
تجھ سے مجھے جدا جب ہونا پڑے گا آخر
ترے فراق میں دل کھونا پڑے گا آخر

کب اور کس طرح ہم اے میری جاں ملے تھے
اک راز ہے یہ اب تک ہم تم کہاں ملے تھے
اے زندگی مگر یوں دُنیا میں ہم رہے ہیں
یک جان اور دو قالب ہو کر بہم رہے ہیں

دُنیا کے رنج اُٹھائے اور راحتیں بھی دیکھیں
آرام بھی اُٹھائے اور کلفتیں بھی جھیلیں

تیری رفاقتیں جب آتی ہیں یاد اے جاں
تیری محبتیں جب آتی ہیں یاد اے جاں
اس دم تری جدائی ہوتی ہے شاق مجھ کو
بے شک رلائے گا خوں تیرا فراق مجھ کو
صدمہ نہ یہ کبھی میں اے جاں اٹھا سکوں گی
ڈھارس نہ اپنے دل کی ہرگز بندھا سکوں گی
لیکن نہ بھول جانا اک آرزو مری تم
یہ بات یاد رکھنا اے میری زندگی تم
ہو کوچ جب تمہارا دنیائے جاوداں کو
چپکے سے چھوڑ جانا اس جسمِ ناتواں کو

"ہمایوں" جنوری سنہ ۱۹۲۸ء

مہدی علی خاں

....کے نام

مری جاں آہ تو مجھ سے جدا ہے — مرا درد، آہ! دردِ لا دوا ہے
مگر یہ درد بھی شیریں ہے کتنا — جو تیری یاد نے مجھ کو دیا ہے
تری تصویر ہے مایوس دل میں — یہی اب زندگی کا آسرا ہے
مرے دل میں ہے اک دھندلا سا نقشہ — جو کچھ گذرے دنوں کا آئینہ ہے
میں حیراں ہوں کہ تیرے درد سے بھی — نہ جانے کیوں مجھے کچھ پیار سا ہے
مرا دل پیار اگر کرتا ہے تجھ سے — بلا سے گر مجھے غم کھا رہا ہے
تو سونا کر گئی ہے دل کا مندر — پجاری اب بھی تجھ کو ڈھونڈتا ہے

ہوئی ہے اب عیاں مجھ پر حقیقت
تو پہلے بُت تھی لیکن اب خدا ہے

"ہمایوں" مئی ۱۹۳۵ء

بشیر احمد

موت کی فتح

جب میں مر جاؤں تو میرے لئے اس سے زیادہ دیر ماتم نہ کرنا
جتنی دیر کہ تم سنو بیزار اداس ماتمی گھنٹے کو
یوں منادی کرتے دنیا میں کہ میں چل دیا ہوں
اس ذلیل دنیا سے ذلیل ترین کیڑوں کے ساتھ رہنے !

نہیں بلکہ اگر تم یہ سطر پڑھو تو یاد نہ کرنا
اس ہاتھ کو جس نے اسے لکھا، کیونکہ مجھے تم سے اتنی محبت ہے
کہ تمہارے پیارے خیالوں میں میں فراموش ہو جانا چاہوں گا۔
اگر میرا خیال کرتے ہوئے تم ذرا سے غمگین بھی ہو جاؤ۔

آہ! میں کہتا ہوں کہ اگر تم ان اشعار کو دیکھو
جب کہ شاید میں مٹی میں مٹی ہو چکا ہوں
تو اتنا بھی نہ کرنا کہ میرا حقیر نام دہرا دو
بلکہ میری جان ہی کے ساتھ اپنی محبت کو بھی مٹ جانے دینا!

کہیں ایسا نہ ہو کہ عقلمند دنیا تمہاری آہوں کو سُن پائے
اور میرے جانے کے بعد میرے ساتھ تمہاری بھی ہنسی اڑائے

(شکسپیئر) "ہمایوں" نومبر ۱۹۴۰ء

عطاء اللہ کلیم

عشق و سکون

جہاں میں ایسے دو پاکیزہ نورانی فرشتے ہیں

ہمیشہ اہلِ عالم میں ہے جن کی جنگ کا چرچا
تعجب ہے، تصور میں بھی وہ ہوتے نہیں یک جا
کہ ان میں حق و باطل کی طرح ہر وقت جھگڑے ہیں
جدا اک دوسرے سے روز و شب کی طرح رہتے ہیں
کبھی ممکن نہیں ہے ایک ساعت میں ظہور ان کا
کہ ہے اک دوسرے سے مرکزِ پرواز دوراں کا

نزاعِ باہمی ان میں بپا رہتی ہے کہتے ہیں

امید و ناامیدی گھر بنائیں ایک ہی دل میں
نشیمن گرچہ ہو اک شاخ پر قمری و شاہیں کا
اگرچہ ایک ہی سینے میں ہوں شادی و غم یک جا
مگر ہے روح جس دم تک عناصر کی سلاسل میں
نہ ہو گا خاتمہ عشق و سکوں کی جنگ خونیں کا
چکائے گی فقط موت ان فرشتوں میں ہے جو جھگڑا

"ہمایوں" مئی ۱۹۳۱ء

کمالِ حیات

نصیب ہو اگر انساں کو جسم و عمرِ شجر
مثالِ برگدِ دیرینہ ہو قیام اگر
تو اس کا نام نہیں ہے کمالِ ذاتِ بشر
ہزار سال جئیں بھی تو کب فنا سے مفر
حسین تر تو وہ گل ہے جو وقتِ صبح کھِلے
دکھا کے شام تک اپنی بہار مرجائے

اگرچہ عمرِ طبیعی ہے گل کی آٹھ پہر
یہ رنگ و بُو نہیں دیکھے کسی میں ہم نے مگر
نہ اس کی عمر ہی برگد سی اور نہ وہ پیکر
مگر کہاں شجرِ پختہ اور کہاں گُلِ تر
حقیر جن کو سمجھتے ہیں ہم حقیر نہیں
کمالِ ذات میں ان کا کوئی نظیر نہیں

"نیرنگ خیال" نومبر ۱۹۲۷ء

مجازؔ ردولوی

رُودادِ محبّت

میں نے ہنگامِ صبح، اے دنیا
تیرے گلشن سے پھول اک توڑا
اپنے پہلو میں دی جگہ اُس کو
چبھ گیا دل میں لیکن اک کانٹا
شام ہوتے ہی میں نے یہ دیکھا
گُل تھا پژمردہ، درد باقی تھا

حُسن و خوشبو میں اک سے اک بڑھ کر
اور بھی ہوں گے تجھ میں گُل پیدا
میری گُل چینیوں کا وقت مگر
ایک مدّت ہوئی کہ ختم ہوا

اور اب جب کہ رات طاری ہے
گُل نہیں پاس، درد باقی ہے

(ٹیگور)
"ہمایوں" مئی ۱۹۳۴ء

حامد علی خاں

نیکی

نیکی کرو ، نیکی کرو!
نیکی کرو ، جتنی بھی ہو
ہر اک وسیلے سے کرو
ہر اک طریقے سے کرو
ہر شخص سے کوئی بھی ہو
ہر وقت جب تم کر سکو
ہر اک جگہ نیکی کرو
جس وقت تک تم کر سکو

"ہمایوں" ۱۹۳۸ء

بابو رام پیارا لال

نکاتِ شیکسپیر

خیالات رکھتے ہو جیسے بلند
تمہارا چلن ان سے ہو چار چند

ضرورت پڑے تو بنو شیر مرد!
ہزاروں، کروڑوں میں کہلاؤ فرد

جواب اینٹ کا تم بھی پتّھر سے دو
کسی کے ڈرائے نہ ہرگز ڈرو

اگر ہے کسی سخت آفت کا ڈر
کرو سامنا ہو کے سینہ سپر

زمانے میں کمزور دل آدمی
جوانمردوں کی کرتے ہیں پیروی

تمہیں مردِ میداں وہ جب پائیں گے
تو دل اُن کے بھی جوش میں آئیں گے

بنیں گے جواں مرد وہ منچلے
ارادے کے پکّے نڈر شیر سے

ماہنامہ "ترجمان"، نومبر ۱۹۱۷ء

کلیمؔ

شباب

(۱)

ایک گُل رو مطربِ رنگیں نوا
ہے فرازِ کوہ پر نغمہ سرا

ساز اس کا کیف سے لبریز ہے
ہر ترانہ اس کا وجد انگیز ہے

کہہ رہا ہے دل کشا انداز میں
یاس کا نغمہ نہیں اس ساز میں

میری قسمت میں نہیں لکھی شکست
آسماں بھی سامنے میرے ہے پست

حلقۂ مہتاب ہے میری رکاب
نامور ہوں، نام ہے میرا شباب

(۲)

ہائے! وہ کالی بلا تاریک رات
کانپتی ہے جس سے ساری کائنات

ساتھ لائی ابر اور طوفان کو
ہیبت و تخریب کے سامان کو

اک طرف برقِ تپاں کا اضطراب
اک طرف زور آزما تنہا شباب

نام ہلنے کو نہیں لیتا مگر
جیسے پتھر ہو کوئی کہسار پر

کہہ رہا ہے "صبحِ خنداں ہے قریب
چھپ چلی ہے رات کی شکل مہیب

خلد میں ہوتا ہے مردوں کا قیام
اوجِ سدرہ پر رقم ہے ان کا نام

ہے نظر میں ان کی چرخِ ہفتمیں
طائرِ دل ان کا ہے طوبیٰ نشیں"

"ہمایوں" اکتوبر ۱۹۳۱ء

سید وقار احمد

حیاتِ محبّت

تم مجھ سے بچ سکتی ہو کیا؟ ہرگز نہیں ، ہرگز نہیں!
جلوے نگاہوں میں مرے
کون و مکاں کے ہیں بھرے
مجھ سے چھپو گی کس طرح میں دیکھ ہی لوں گا تمہیں!
اے جان! جب تک تم ہو تم
اے جان! جب تک میں ہوں میں
جب تک سماوی طاقتیں جب تک یہ دورِ افلاک کا
تم کو ، مجھے زندہ رکھے
مجھ سے جو نفرت ہو تو ہو
لیکن میں تم سے ہر گھڑی الفت ہی کرتا جاؤں گا
گر تو کنارہ کش رہے
چاہت ہی کرنا چھوڑ دے
تو وجہ کیا ہے دوسرا اس فرض سے غافل رہے

لیکن مجھے یہ خوف ہے یہ زندگی میری کہیں!
میری خطا ثابت کرے
لیکن نہیں، ممکن نہیں
یہ بات تو ہے طے شدہ قسمت کا ہے یہ فیصلہ
کوشش مگر بے انتہا
کرتا ہوں لیکن فائدہ
ہاں کامیابی کی جھلک آتی نہیں مجھ کو نظر
اچھا تو کیا دنیا میں۔ مَیں
ناکام ہی رہ جاؤں گا
ہاں وہ کبھی مرتا نہیں! کچھ جس کے دل میں عشق ہو

کھا کر جو ٹھوکر گر پڑے ہنستے ہیں اس پر اس لئے
کچھ ہوش میں آجائے وہ
اور جوش میں آجائے وہ
سیدھی طرح ہو اٹھ کھڑا اور دوڑ میں مصروف ہو
پھر ہوش آتا ہے مجھے
دل میں ہے پھر اک جوش سا
تیرا تامل دیکھ کر! طرزِ تغافل دیکھ کر

پھر میں بھی راہِ عشق میں
ہوتا ہوں گرمِ مدّعا
گرد و غبارِ جستجو! اور تیرگیٔ آرزو!
گو چھیر کر تیرِ نظر پڑتی ہے مجھ پر جب کبھی
رنج و محن ہٹ جاتے ہیں
بادل سیاہ پھٹ جاتے ہیں
اور شمعِ منزل بن کے وہ دکھلاتی ہے رستہ مجھے

پیکاں کوئی امید کا خالی پلٹ آتا ہے گر
ترکش سے فوراً اور اک اور پھر نشانہ تاک کر
میں کھینچتا ہوں دوسرا
دیتا ہوں میں اس کو چلا
رہتا ہے جاری سلسلہ بڑھتی ہیں اُمیدیں مری
لیکن نہ چھوٹا ہاتھ سے
دامانِ امید آج تک
اور میں نہ اب تک یاس کا شرمندۂ احساں ہوا

نیرنگِ خیال، اکتوبر ۱۹۲۷ء

اخترؔ عظیم آبادی

جذباتِ طامس مور

چھوڑ جائے گا یہاں مرمٹ کے تیرا غمگسار
شہرت اپنے جرم و حسرت کی بطورِ یادگار
زندگی تیرے لئے جو کی گئی تھی وقف آہ
عبرت عبرت! اک خدائی اس پہ لائی حرف آہ
مجھ پہ لعنت غیر کرلیں جس قدر بن آسکے
فیصلہ ان کا تو ڈھل جائے گا تیرے اشک سے
گرچہ اس وقت آہ میں محقور ہوں مقہور ہوں
عاشق شوریدہ سر وارفتہ رنجور ہوں
کشتنی سمجھا کریں دشمن مجھے کیا باک ہے
باوفائی کا مری شاہد خدائے پاک ہے
تیری بہبودی تھی مرکز میری عقل و فکر کا
اے وطن! بس ذکر تیرا ہی تھا محور ذکر کا

عالمِ طفلی و بیداری و خواب و یا شباب
تیرے سودا نے کیا تھا ان کو نذرِ التہاب
مجھ کو فرصت ہوگئی تھی خوف رسن و دار سے
فکر تھی تجھ کو چھڑاؤں پنجۂ اغیار سے
خاتمہ بالخیر کی جب کہ دُعا مانگوں گا میں
اپنے شامل لب پہ تیرا نام بھی لاؤں گا میں
تیرے ان عشّاق کی ہستی ہے قابلِ فخر کے
دیکھنے کو جو تری عظمت کے دن زندہ رہے
لیکن ان کے بعد اعلیٰ تر ہے اس کا مرتبہ
ناز جس کو ہے کہ وہ تیرے ہی کارن مر مٹا

ماہنامہ "شباب اردو" مارچ سنہ ۱۹۲۳ء

سید سراج الدین علی خاں

جسم و جاں

محبوس ہوئی کس لئے اے مظہرِ یزداں
اس قالبِ عصیاں میں بہ اغوائے اہرمن
اک کاخِ فزوں مایہ میں ہے بےبس و حیراں
جس کے سقف و بام ہیں صد روکشِ گلشن

دم بھر کی رہائش پہ یہ افراط تصرف
اثبات کی منفی میں یہ تعمیر کا ساماں
انجام بھی اس کا نہیں محتاجِ تعرف
حشرات زمیں کے لئے اک دعوت ذی شاں

اے روحِ رواں تیرے لئے باعث عبرت
ہیں جسم فناگیر کے پامال عناصر
تب کیوں نہ ترا نفس بہ اندازۂ فطرت
آراستہ باطن میں ہو سادہ رہے ظاہر

گوندھی گئی آدم کی کف خاک اجل سے
اور روح بنائی گئی آزاد ازل سے

عبدالرحیم واصل

عشق و عقل

لاریب حسن وعشق کو وحدت پسند ہے
کثرت میں اصلیت کو کیا اس نے بند ہے
انداز وجد میں عشق سماتا نہیں کبھی
اور عقل سے تو آنکھ ملاتا نہیں کبھی
میدان عشق میں جو چلے مرد ہو گئے
طالب ہوئے جو عقل کے وہ سرد ہو گئے
جب آ کے دل میں عشق نے ڈیرا جما دیا
کر کے اشارہ عقل کا رستہ بتا دیا
روشن ہے شمس عشق کا سارے جہان پر
ہر وقت ہر دیار و زمین و زمان پر
عقل و خرد کو تاب نہیں اس کے سامنے
پوچھے تو کچھ جواب نہیں اس کے سامنے

تعلیمِ عشق کرتا ہے سب سہو محو کی
اور عقل، بحث، ہندسہ وصرف ونحو کی

داماں کیا جو عشق نے دل چاک کر دیا
کر کے ہوا۔ حواس کو تن خاک کردیا

کشتہ جب اس کے سوز کا اکسیر بن گیا
فیضِ ازل کے راز کی تصویر بن گیا

ماہنامہ "مخزن" جنوری سنہ ۱۹۱۴ء

وحید

پھول

ایک حسین کل یاسمین کے پھول مجھ کو دے گیا
جاتے جاتے ان میں اک رنگِ تبسّم بھر دیا
ان کی خوشبو مسکراتے شوخیاں کرنے لگی
رقص میں موجِ ہوا، بدمستیاں کرنے لگی
پھول کا عکسِ تبسّم دل پہ میرے پڑ گیا
اس گراں باری سے دل بیتاب ہو رونے لگا

مشک زا جوڑا کہاں وہ کان کے بالے کہاں
میں ہوں محرومِ تمنّا اور سرگرم فغاں
ہاں پسینے میں کسی کے مل کے آئی بو اگر
اس مہک کی مستیاں مجھ کو بناتیں بے خبر

اک جہاں مسرور، مجھ پر یہ اثر اُلٹا ہوا
بُوئے گل نے آتشِ غم کو مری بھڑکا دیا

دل یہ کہتا ہے کہ سارے پھول مَل کر پھینک دو
لطف کیا ہے جب پہننے والا پھولوں کا نہ ہو

ماہنامہ "تاج" حیدرآباد دکن
ماہ شہریور سنہ ۱۳۴۳ ف

تغیّرِ زمانہ

ہم نے یہ مانا کہ دنیا ہے پُراز رنج و ملال
ایک دن فصلِ بہاری سب کو کر دے گا بحال
صبح صادق آئے گی اور آ کے پھیلائے گی نُور
فصلِ گُل سے ہوں گے سب وارفتۂ عیش و سرور
پھُول گلشن کے بھلا دیں گے غم و رنج و محن
آج جو کرتے ہیں ماتم کل وہ ہوں گے خندہ زن
رنج کیوں کرتے ہیں دُنیا میں یہی معمول ہیں
خار کے انبار جو ہیں آج وہ کل پھُول ہیں
ہوں مصائب لاکھ دُنیا میں مگر پھر کیا کریں
اس سے کیا حاصل کہ دن بھر رات بھر رویا کریں
ایک ذلّت ہی نہیں دنیا میں عزت بھی تو ہے
اک مصیبت ہی نہیں دنیا میں راحت بھی تو ہے

صبر اے دل صبر اس رونے سے کچھ حاصل نہیں
اس طرح پر وقت کو کھونے سے کچھ حاصل نہیں

کیا نتیجہ اس قدر رونے سے ہے زار و قطار
ہے مصیبت آج، کل راحت ملے گی بیشمار

باغِ دل میں حسرتیں جو جمع ہیں بُو کی طرح
کل بھریں گی چوکڑی صحرا کے آہو کی طرح

کل یہ ہوگی جانِ شادان آج ہے جانِ حزیں
ایک حالت پر کبھی دُنیا وفا رہتی نہیں

ماہنامہ "الناظر"، جولائی ۱۹۱۷ء

عطاءُ اللہ کلیمؔ

قصرِ گیتی

سرابِ رنگ و بو ہے، ایک پُر اسرار بستی ہے
جہاں کے ہر در و دیوار پر ہیبت برستی ہے

تہِ سقفِ منقش، فرشِ دلکش ہے زمرّد کا
مگر فطرت سکوں کو قصرِ گیتی میں ترستی ہے

کہیں ہے منظرِ عشرت، کہیں تصویرِ ناکامی
نقوشِ مختلف سے زینتِ ایوانِ ہستی ہے

ازل سے آنکھ محوِ جستجو ہے، ہمنشیں لیکن
ابھی تک صاحبِ خانہ کی صورت کو ترستی ہے

غمِ انجام سے اس قصر میں آتش بجاں ہوں میں
خدا جانے! گرفتارِ بلا یا میہماں ہوں میں

ماہنامہ "ادبی دنیا" اکتوبر ۱۹۳۰ء

تلوک چند محرومؔ

نکاتِ شکسپیئر

قسم اے ماہرو امت چاند کی کھا ہے فطرت میں تلوّن آشنا چاند
بدلتا ہے مہینے کے مہینے نئی صورت دکھاتا ہے سدا چاند
کہیں ایسا نہ ہو تیری محبت بنے تغیّر کے افلاک کا چاند

Romeo and Juliet, Act 2, Sc 2

جو ناپاک تخیّل ہے، اس پہ لعنت نہیں نفرین کے قابل عیش وعشرت
ہوس کیا ہے؟ اک آتشِ خونچکاں ہو بری خواہشوں سے جو ہوتی جواں ہے
جل اٹھتی ہے دل میں بھڑکتی ہے یکسر ہوا دیتے ہیں جب خیالاتِ ابتر

Merry wives of windsor, Act 5, Sc 5

آہیں نہ بھرو، تم اے حسینو! ایسا نہ کرو، تم اے حسینو!
ہے مرد کی ذات ازل سے عیّار دو کشتیوں میں ہمیشہ سوار
اس کا ہے یہی وطیرہ دائم اک بات پہ کب رہا یہ قائم

Much Ado about nothing, Act 2, Sc 3

ماہنامہ "آج کل" جنوری سنہ ۱۹۴۶ء

جعفر حسینی جعفر

رُوح کا مکالمہ خدا کے ساتھ

نازِ طفلی کے سہارے میری طبع راز جو
یوں مخاطب حق سے تھی اے خالقِ ہر رنگ و بو
جسمِ خاکی میں مرے اے مالک ہر خشک و تر
رُوح تیری جلوہ فرما نُور تیرا جلوہ گر
کار فرما ہے یہاں قانونِ قدرت کون سا
فلسفہ کیا ہے بھلا آخر حیات و موت کا
جان پر بارِ غمِ ہستی اُٹھالاتا ہے کیا
اور پھر یہ جاں بہ حق تسلیم فرماتا ہے کیا
دستِ فیضانِ ازل سے اپنے یارب کر عطا
اک مسرت بے نہایت اک الم لاانتہا
کر عطا یارب بلانوشی کا وہ اعلیٰ مقام
ہر مسرّت نذرِ صہبا ہر مصیبت غرقِ جام

منکشف ہو جائیں جس سے رازہائے کائنات
رازِ تخلیقِ حیات و رازِ تحلیلِ حیات
زندگی اور جذبۂ اُلفت کے پیچیدہ نکات
قبر کے اسرار لرزاں جس سے رُوحِ کائنات
التجا دل ہی میں تھی یوں غیب سے آئی ندا
طفلکِ نادان تری مقبول ہوتی ہے دُعا
کیا قیامت ہے جتا دے گا یہ تیرا التماس
جذبۂ رنج و مسرت جذبۂ اُمید و یاس
بادۂ عیش و مسرت بادۂ نام و نمود
خواہد ارزاں داشت از بہر تو ایں چرخ کبود
تجھ کو پہنا کر ادب سے بہجت و شہرت کا تاج
ساکنانِ ارض لائیں گے عقیدت کے خراج
آگ اُلفت کی جلا ڈالے گی جب تیرا لہو
شعلۂ غم سے نکھر جائے گی تیری آرزو
تجھ کو پہنچا دے گی اس منزل پہ جب جا کے گی تو
تیری طِفلانہ تمنّا تیری اندھی آرزو
تو اماں مانگے گی اُس دم آرزو خام سے
تا نکل آئے فریبِ نفسِ نافرجام سے

اک بصیرت عرش سے نازل کروں گا بے گماں
زینۂ اول ہیں جس کے بام کے ہفت آسماں
وہ بصیرت جو دکھا دے گی رہِ امن و اماں
روشنی میں جس کی مل جائیں گے منزل کے نشاں
تجھ پہ کھل جائیں گے اس دم رازہائے کائنات
رازِ تخلیقِ حیات و رازِ تحلیلِ حیات
موت کیا ہے مرہم زخم خراب زندگی
موت میں تابندہ تر ہے آفتابِ زندگی
عالم امکاں کی ہر شئے ہے مری آئینہ دار
زیست بھی آئینہ دار اور موت بھی آئینہ دار
زندگی منشور ہے میرے ہی نورِ ذات کا
موت بھی اک عکس ہے میری تجلیات کا

ماہنامہ "آج کل" مئی سنہ ۱۹۶۴ء

محشرؔ عابدی

حسنِ معصوم

وہ حسن میں یوں متحرک ہے جیسے رات کی تاریکی
جس میں ابر نہ چھائے ہوں، ہو تاروں کی سیمیں تابانی
پھر تاریکی اور نور میں جو کچھ سب سے زیادہ اچھا ہے
وہ آنکھوں میں اور چہرہ پر اس کے صاف جھلکتا ہے
اس کے حسن کی تنویروں میں ایسی لطافت پنہاں ہے
جس سے دن کی روشنی بھی محروم و نظر بر داماں ہے
گو نور ذرا سا بڑھ جاتا یا اور ذرا سی تاریکی
تو حسن کی یہ جادو اثری اس میں باقی نہ رہ جاتی
وہ حسن جو گھونگروالے گیسو میں ہے مسلسل لہراتا
یا ایک ادائے ساحر سے چہرہ پہ ہے رہتا تھراتا

جس جا کہ خیالات دلکش کہتے ہیں زبانِ حال سے یہ
کس درجہ پیاری اور مطہر رہنے کی ہماری جا ہے یہ

اور عارض گلگوں پر اس کے اور اس کی جبین رنگیں پر
اس درجہ لطیف، اتنی ساکن اور ایسی حسین جان پرور

جو رنگ بدلتے ہیں الواں جو رقص تبسم کرتا ہے
اک عیش میں گزری دنیا کی وہ داستاں گویا کہتا ہے

اک ایسا دماغ ساکن ہے جس میں ہے مسرت اور راحت
اک ایسا دل پُر اُلفت ہے جس میں ہے نہاں معصومیت

ماہنامہ "سروش"، اپریل سنہ ۱۹۳۰ء

محمد یحییٰ اشہر

شعاعِ مہر

جا رہا ہے رفتہ رفتہ سوئے مغرب آفتاب
کوہ کی رفعت سے رخصت ہو رہی ہے آب و تاب
اک شعاع آخری لیکن ہے وجہ اضطراب
ارغوانی رنگ سے پیدا ہے شانِ التہاب
منظر قدرت پہ ہے گویا شباب آیا ہوا
کوہ پر ہے یا کوئی مست شراب آیا ہوا

نُور افزا جب سپیدہ صبح کا ظاہر ہوا
نغمۂ بلبل سے گونج اُٹھی تھی جنگل کی فضا
اوس کے قطروں میں برق نور کو چمکا دیا
نقرئی چادر کو گویا کھیت پر پھیلا دیا
اے شعاع مہر تو ہے رونقِ بزم جہاں
گرم تیری ضو سے ہے ہنگامہ رزم جہاں

بحرِ پُر طوفان کے سینے پر رواں ہے اک جہاز
باد بان لہرا رہا ہے تو ہے اس سے محو ناز
کر چکا جب بند سازِ نغمہ ہائے جاں نواز
تجھ کو چروا ہے نے دیکھا گھانس پر جلوہ طراز
تیتری نے بھی نگاہِ شوق سے دیکھا تجھے
شاہدِ گل نے وفورِ ذوق سے چوما تجھے

کس قدر ظلمت رہا ہے تیرے چہرے کی ضیا
جس کے پرتو سے ہر اک گوشہ منور ہو گیا
کنج تاریکی تھا۔ اک افلاس کا مارا ہوا
صبح کے پردہ میں جو پہروں تجھے ڈھونڈا کیا
روزنِ دیوار ہی میں تجھ کو رقصاں دیکھ کر
ہو گئی بشرے پہ اس کے موج خندہ جلوہ گر

دیکھتا ہے قید خانہ کی سلاخوں سے اسیر
نامرادی، حسرت وارماں ہیں جس کے ہم صفیر
کہہ رہا ہے مہرباں ہو کاش مجھ پر چرخ پیر
اے شعاعِ مہر بن جا تو ہی میری دستگیر
ہیں مرقع ہوں الم کا، رنج کی تصویر ہوں
شرحِ غم ہوں، مصحفِ اندوہ کی تفسیر ہوں

رفتہ رفتہ اے شعاعِ مہر تو ہو جا نہاں
اضطراب شوق دل میں لے رہا ہے چٹکیاں
کاش میرے قلب میں پیدا ہوں ایسی گرمیاں
جس کو برماتی رہیں تیری تبسّم ریزیاں

جوشِ مستی میں، وفورِ شوق میں رقصاں رہوں
زمزمہ پیرا رہوں، فرحاں رہوں شاداں رہوں

"تمدن" ستمبر ۱۹۱۸ء

بشیر احمد

سپاہی

اگر میں مرجاؤں تو صرف یوں مجھے یاد کر لینا
کہ کہیں ایک کونہ ہے کسی اجنبی سرزمین کا
جو ہمیشہ کے لئے انگلستاں ہے
اس زرخیز زمین میں ایک زیادہ زرخیز مٹی چھپی ہوگی !
مٹی جسے انگلستاں نے پیدا کیا، سانچے میں ڈھالا، آگاہ کیا !
اُسے دیئے کبھی اپنے پھول پیار کرنے کے لئے اور اپنی راہیں گھومنے کے لئے،
انگلستان ہی کا ایک جسم انگلستان کی ہوا میں سانس لیتا ہوا۔
وطن کے دریاؤں سے سیراب اسی کی کرنوں میں پھولتا پھلتا
اور سمجھ لینا کہ یہ دل جس کے سب گناہ دھوئے گئے
جو اب ازلی نفس کے اندر محض ایک نبض ہے
اب بھی کہیں نچھاور کر رہا ہے خیالات جو انگلستان نے اسے دیئے !
انگلستان کے نظارے اور آوازیں یا سپنے اس کے دنوں کی طرح مسرور
اور ہنسی دوستوں سے سیکھی ہوئی، بردباری
پُرامن دلوں کی انگلستان کے آسماں تلے۔

(روپرٹ بُروک)

"ہمایوں" نومبر ۱۹۴۰ء

محسن زیدی

اکیلی گھسیارن

دیکھ تو ! کچھ دور پر جلوے ہیں کیا بکھرے ہوئے
اک حسین ، پروردۂ کہسار تنہا کھیت میں
فصل کاٹے جا رہی ہے گا رہی ہے گیت بھی
ٹھہر کر یہ گیت سُن ، آگے نہ جا آہٹ نہ کر
کاٹتی ہے فصل اور رکھتی ہے گٹھے باندھ کر
مضطرب ہے والہانہ گیت ہونٹوں پر مگر
سُن لے ان نغموں کو اے راہ خرد کے رہنما
گونجتی ہے وادیوں میں جن کی مستانہ صدا
وہ عرب کے قافلے صحرا و ریگستان میں
ہم سفر ہوتی تھی جن کے بے کسی بے چارگی
بلبلوں کی جب چہک سنتے تھے نخلستان میں
پر کشش اتنی کہاں محسوس کرتے تھے بھلا
دل میں ان آتش نفس نغموں سے اک اٹھتی ہے ہوک
اس کے آگے بے اثر ہے فصل گل کوئل کی کوک

توڑ ڈالا اس کے گیتوں نے سمندر کا سکوت
دور ہبریزی جزائر کے مناظر کا سکوت
کون بتلائے گا مجھ کو اس کے دل کا سوز و ساز
ہاں مگر کہتی ہے کچھ پیہم صدا فریاد کی
ذہن میں مبہم سے ہیں اندوہ گیں ماضی کے راز
زیست کی پیکار نے دنیائے دل برباد کی
شاید ان گیتوں میں کوئی آج کل کی بات ہو
جس سے سب واقف ہوں معمولی سی ہو، دن رات ہو
یا غم ہستی زیان و درد کا احوال ہے
جو ہمیشہ سے ہر اک دل کا شریک حال ہے
جو بھی مقصد ہو کہ ہیں کس بات پر یہ اس کے گیت
ہے یہ لافانی حسینہ اور امر ہیں اس کے گیت
میں نے اس کو کھیت میں اس طرح دیکھا نغمہ زن
ساز تنہا ہنسیا کا، سونے کھیت اس کی انجمن
سن رہا تھا میں وہ نغمے بے خود و مستانہ وار
اک پہاڑی کی گیا چوٹی پہ پھر دیوانہ وار
دشت و وادی، بحر و بر تھے کیف میں ڈوبے ہوئے
دل میں جو نغمے چھڑے تھے وہ نہ لب پر آسکے

نادر کاکوروی

خواب نوشین

صاف ستھرے نرم بستر پر پڑا ہے اک امیر
باادب حاضر ہیں خدمت کے لئے ہر نا و پیر
دم بخود خاموش بیٹھے ہیں مہذب اور شریر
ہاں مگر اک نیند کرتی ہے اداؤں میں اسیر
دور سے دکھلا کے اڑجاتی ہے روتے دل پذیر
شوخیاں کرتی ہے ترساتی ہے تپکاتی ہے نیند

بج گیا دو اور سر پر آگیا ماہ مبیں
سوگئی آبادی آدم کی آدھی سر زمیں
ہلکے ہلکے جھونکے دیتی ہے ہوائے عنبریں
اونچے کوٹھے پر ہوا میں باول اندوہ گیں
ایک پھولوں کی پلنگڑی پر پڑی ہے نازنیں
چاہتی ہے نیند آجائے نہیں آتی ہے نیند

تھک گئے افسانہ گو عاری ہوئے سب قصہ خواں
مل چکے تلوؤں میں کاہو سر پہ کیوڑا خادماں
باغ میں آغوش گل میں اک پڑا ہے نوجواں
کوئی پنکھا جھل رہا ہے کوئی کہتا ہے کہ ہاں
نیند پیاری نیند آ جا سو رہی ہے بلا کر کہاں
ہو گئی صبح اور نہ اب آتی ہے تب آتی ہے نیند

بادشاہوں اور وزیروں کو ہے فکر صلح و جنگ
عابد و زاہد ہیں فکر پرستش عقبیٰ میں دنگ
شاعروں کا قافیہ فکر مضامیں میں ہے تنگ
ان سبھوں کو ہے غم دنیا و دوں سینہ کا سنگ
ہاں وہ بے فکر ہے جنھیں ہے نام سے فکروں کے ننگ
ان دلاروں ان پیاروں کو سلا جاتی ہے نیند

آہ ان محنت زدوں کا کون تھا پرسان حال
ان تھکے ماندوں غریبوں کا کسے تھا کچھ خیال
اغنیا کی خدمتوں میں ہو رہے ہیں پائمال
دن کی محنت ضعف کی شدت سے چہرہ ہے نڈھال
نیند کر دیتی ہے لیکن قوت رفتہ بحال
کس قدر غربا نوازی آکے فرماتی ہے نیند

وہ ہوا وہ شور طوفاں وہ تھپیڑے موج کے
گرتے ہیں پانی پہ اٹھ اٹھ کر جہاز اس طرح سے
گویا پتے تھے کہ آندھی میں اڑے اور آ گرے
اونچے مستولوں پہ ملاحوں کے لونڈے ہیں پڑے
اپنی میٹھی نیند سوتے ہیں مگر حیرت یہ ہے
تو اس آفت میں انھیں کیونکر سلا جاتی ہے نیند

رات کو بچے ٹھنکتے ہیں ہمیں بسکٹ ملیں
کہہ رہی ماں کہ بیٹا سو رہو تو چیز دیں
چوک سے ابا تمہارے مول لے کر آ تو لیں
اتنے میں نیند آ کے کھو دیتی ہے سب ان کی ہٹیں
تھپکیاں دے دے بھلاتی ہے بچوں کی ضدیں
ٹھونک کر مچلے ہوئے بچے سلا جاتی ہے نیند

مچھروں کی بھنبھناہٹ اور بازاروں کا گند
اس میں حلوائی پڑے سوتے ہیں دوکانوں میں بند
ہو رہی ہیں ان کے خراٹوں کی آوازیں بلند
آہ ان لوگوں کی تو اے نیند اتنی دردمند

کلبۂ احزاں سے تجھے اے موہنی اتنا پسند
اور یہ شاہی کوچ کچھ تجھ کو نہیں بھاتی ہے نیند

اے پیاری نیند سب ذی روح بالے ہیں ترے
سارے حیوانات دنیا کے حوالے ہیں ترے
بچے سے بوڑھے تلک گودوں کے پالے ہیں ترے
کیوں یہ مزدور سے ہی اک آرام والے ہیں ترے
کیوں امیروں کے گھروں میں ایسے لالے ہیں ترے
کیوں ستو ان آرام گاہوں میں نہیں آتی ہے نیند

خواب نوشیں تری راحت میں نہیں کوئی کلام
لیکن ایسی ہی جدائی ہے تو نادر کا سلام
خواب تو وہ خواب ہے خواب اجل جس کا ہے نام
وصل جس کا دائمی ہے جس کی لذت ہے مدام
قبر میں جب چھوڑ جاتے ہیں اعزا اور غلام
پھر وہاں آتے ہوتے تجھ کو بھی موت آتی ہے نیند

نادرؔ کاکوروی

خوابِ نوشیں

نیم باز آنکھوں میں کس کس لطف سے آتی ہے نیند
ہر روش ہر لغزشِ مستانہ دکھلاتی ہے نیند

ہر قدم پر جھومتی ہے اور لہراتی ہے نیند
کتنا بے خود کن سرور آنکھوں کو پہنچاتی ہے نیند

کیا نشاط انگیز نغمہ کان میں گاتی ہے نیند
کن اداؤں سے تھکے ماندے سلا جاتی ہے نیند

بے پیے کی اس کی مستی بے نشے اس کا اتار
مفت کی اس کی عنایت مفت کا اس کا پیار

نت نئے اس کے تماشے نت نئی اس کی بہار
بے سواری سیر اس کی اسوتڑپ جن پر نثار

باغ جنگل شہر ریگستان دریا کوہسار
رات بھر میں کیسی کیسی سیر دکھلاتی ہے نیند

خواب راحت کی ہے آمد اور دل بے اختیار
ہو رہا ہے لذت یا لین خلوت پر نثار
دائرہ بینش کا ہوتا جا رہا ہے تنگ و تار
چپکے چپکے ہو رہی ہے نیند چشم انتظار
خواب شیریں کے چلے آتے ہیں جھونکے بار بار
ہم تو اے احباب سوتے ہیں ہمیں آتی ہے نیند

لیٹے لیٹے باتیں کرتے کرتے اب ہم سو رہے
سوا ہا ہا یہاں تو اور ہی ڈھٹ نیند ہے
وہ مرے مردے جنھیں آنکھوں سے تھے ہم ڈھونڈتے
ہم کو جیتے جاگتے ہنستے ہنساتے مل گئے
اے پیاری نیند ہیں یہ سب ترے شعبدے
ان مٹی شکلوں کو تو ہی پھر بنا جاتی ہے نیند

نیند ہے اک پاک دیوی اک پری ہے ایک حور
دل کی قوت جسم کی جان اور ہے آنکھوں کی نور
ہے طبیعت اس کی اک لہر ایک جھونکا اک سرور
ہاں اگر کچھ عیب ہے اس میں تو اتنا ہے ضرور
یہ غریبوں سے ہے نزدیک اور امیروں سے ہے دور
چین دیتی ہے انھیں اور ان کو ترساتی ہے نیند

سعیدالدین خاں سعیدؔ

زمزمۂ حیات

سنانا نہ مجھ کو بصد یاس و حرماں
کہ ہے خواب یہ ہستیٔ انساں
نہ ہو گر تاثر تو ہے روح بے جاں
فریب نظر ہے ہر اک نقشِ دوراں

حیات اک حقیقت امنگوں بھری ہے
لحد اس کی منزل نہ حاشا رہی ہے
ملے خاک میں تو کہ اصلاً یہی ہے
مگر روح ایسی نہیں شے کوئی ہے

غم و درد و عیش و طرب اور ہوگا
رہا ہے یہ منشا مسلک ہمارا
عمل ہی عمل ہو ہمارا سراپا
نمایاں ہو امروز سے شان فردا

بے پایاں ہے علم اور سبک رو زمانا
بہادر توانا ہے گو دل ہمارا
دھڑکتا ہے یوں جیسے ملفوف دھونسا
رواں سوئے مرقد ہیں ہم ہر دقیقا

یہ دنیا فقط ہے لڑائی کا میداں
پر اس منزلِ زندگی کے دوراں
نہ رہنا کبھی بن کے درماندہ حیواں
جئے جا مجاہد صفت ہر دم و آں

نہ مستقبل خوش ادا پر ہو ایقاں
رہے نقشِ ماضی سرِ طاقِ نسیاں
ترا حال تیرے عمل کا ہو میداں
خدا پر مگر ہو یقین و ایماں

حیاتِ بزرگاں یہی ہے جتاتی
بنا سکتے ہیں زندگی اپنی عالی
چھٹے جب سراب رہِ زندگانی
کریں دہر پہ ثبت نقشِ مساعی

که بے یار و ناچار و لنگر شکستہ
قطرہ میں جا کر یہ نقشِ خجستہ
رواں بحرِ ہستی میں ہوں دل شگفتہ
کریں عزمِ عالی نہ ہوں دل گرفتہ

پئے جستجو اور حصولِ تمنا
صدا سعی و خدمت رہے کارفرما
دل و جاں کی بازی لگا بے محابا
دکھا حوصلہ اور مصروف ہو جا

ہ ترجمہ صفحہ ۴۳ پر دیکھئے

نظیر حسین فاروقی

حمد

اے ان دیکھے اے الناظر — ازلی ابدی از خود ظاہر
عدم و وجود ہے ہر عالم کا — تیری ہی مرضی پر اے داتا
نا معلوم تخیّل تیرا — قسمت کا ہے اپنا لکھا
خالق ہے وہ ارض و سما کا — مالک ہے تو ازل ابد کا
تجھ ہی سے ہے وجود ہستی کا — تجھ ہی پر ہے عود پھر اس کا

تو تھا تو ہے تو ہی رہے گا — جب سے رنگ رچا محفل کا
نیست سے جب آغاز ہوا تھا — اور ابد انجام ہے جس کا
تودۂ خاک کو تو نے بخشا — پیکرِ انسانی کا نقشہ
ذرّے خاک کے مل گئے باہم — تیری پھونک سے بن گیا آدم
قلب میں موت کے تو نے پھونکی — ایک لافانی رُوح کی پھکنی

اے الناظر اے العالم — روز و شب ہے تجھ سے قائم
ہم پر بخشش کر تو اپنی — راہ دکھا دے ہم کو سیدھی

ظلمت سے تو ہم کو بچا دے   نور کے سایہ میں پہنچا دے
لہو عبث ہے اپنی ہستی   سال مہینہ ایک ایک دن کی
سب کچھ جب مٹ جائے گا   تو ہی رہے گا ملجا ماوا

ظاہر ہے یا جو کہ نہاں ہے   اے مالک سب تجھ پہ عیاں ہے
فعل و خیال انسان کے دل کے   معصیت اور خطرات ہیں جتنے
اے آقا تو اپنے کرم سے   اے مالک تو اپنے رحم سے
راہبری انساں کی ہے کرتا   کاش کہ انساں اس کو سمجھتا
جو کچھ دُنیا میں اچھا ہے   تو ہی نے مالک سب بخشا ہے
روح کی ہے ابدی بہبودی   میرے مالک تیری خوشنودی

ارحم و راحم حمد ہے تیری   حمد تیری عبدیت میری
دونوں جہاں کے مالک آقا   ساری حیات پہ قبضہ تیرا
حشر کے دن تیرا ہی ڈنکا   اے مالک ہر سمت بجے گا
سیدھی راہ چلا ہم سب کو   ان کی راہ چلا تو ہم کو
جن پر تو نے رحم و کرم سے   دروازے رحمت کے کھولے
مالک تو ہی بچا دے ہم کو   مغضوبیں کی راہ سے سب کو

محمد مصطفےٰ احسین آصفی

فرشتۂ نور

اے فرشتۂ نور کے شہباز بامِ آسماں
ہے ضیا گستر تری پرواز بامِ آسماں
طائرِ عرشِ بریں پرواز کرتا جا مگر
محنت آبادِ جہاں کی سمت بھی ہو اک نظر
کر زمیں والوں کو بھی آگاہ منشائے حیات
سونپ دے بندوں کو پیغامِ خدائے کائنات
ہاں اُڑے جا قبلۂ مقصود کی جانب سدا
بال و پر سے دونوں عالم میں وہ پھیلا دے ضیا
جس سے بن جائے فضا میں اک صراطِ پُر شرار
رہنمائی جو کرے انسان کی گردوں کے پار
قیدِ نفسانی سے پھر رُوحِ بشر آزاد ہو
جنتُ الفردوس میں اک بارگی آباد ہو

تازگی پیدا ہو افسردہ دلوں میں پھر وہی
کلفتیں مٹ جائیں ساری دُور ہو واماندگی

صبحِ صادق کی طرح چمکے کِرن اُمید کی
پھر وہی دل میں ہوں لہریں موجزن امید کی

داغ عصیاں کے مٹیں نقشِ جہالت دُور ہو
سارے عالم سے گراں خوابی کی کلفت دُور ہو

دُور ہو رنج و محن جاتا رہے خوفِ ممات
ہاں سُنا دے وہ نویدِ صبحِ جاویدِ حیات

حزن و خوف و جہل اور وسواس کی تاریکیاں
میٹ دیں ذہنِ بشر سے تیری اختر پاشیاں

نغمۂ امید افزائے طرب پھر چھیڑ دے
زندگی دنیا کی پھر خوشتر نظر آنے لگے

دستِ بیضا کا ترے وہ خنجرِ عریانِ نُور
آسمانوں میں چمکتا ہے جو مثلِ برقِ طور

دے انھیں جو ڈھونڈتے ہیں عظمتِ ملکِ دوام
ماورائے قبر ہیں جن کی تمنّائیں تمام

شہرتِ دنیا سے دل اپنا جو بہلاتے نہیں
مدح نظم و نثر میں کوئی مزہ پاتے نہیں

سینہ بے کینہ ہو جن کا اور دل بے باک ہو
زندگی بے داغ، آلائش سے دامن پاک ہو
نُورِ حق کی ہاتھ میں شمشیر ہو جب بے پناہ
ظلمت باطل کی ہو جاتی ہے پھر پسپا سپاہ
ظلمتوں کا دام ہے یاں ہر طرف پھیلا ہوا
دانہ زہر آلود اور صیاد پر مکر و دغا
خیر کے پردے میں پوشیدہ یاں عفریتِ شر
نام ہیں جن کے مسرت امن و صلح و مال و زر
ہاں اُڑے جا! اے فرشتہ! بال و پر کھولے ہوئے
ہو ضیا افگن جہاں پر سیم و زر تولے ہوئے
نورِ ایماں کے شرر اُڑتے پھریں ظلمات میں
بن کے سیارے ہدایت کے اندھیری رات میں

منوّر لکھنوی

دُعائے خیر

اے نونہال گلشن ہستی بامراد
تو زندہ باش و عمرِ عزیزت دراز باد

نوعِ بشر کے درد سے تو آشنا رہے
تیرا شعار خدمت خلق خدا رہے

منظور اک زمانہ کی ہو بہتری تجھے
ہر بات میں نصیب ہو نام آوری تجھے

تو اک سفینہ دار ہے بحرِ حیات میں
تجھ سے بہار ہے چمنِ کائنات میں

قدرت محیط ہے صفتِ بحر چارسو
ایک اس کی لہر کھیلتی ہنستی ہوئی ہے تو

جس طرح تیرے واسطے ہم ہیں دعا بلب
پڑھتے ہیں کلمۂ برکت دل سے روز و شب

دنیا بھی تیرے حق میں دعا گو مدام ہو
اتنا تجھے رفاہِ خلائق سے کام ہو

سعید الدین خاں سعید

یوسف

اندھیری رات تھی چاروں طرف چھایا تھا سناٹا
کہ آیا خیمۂ یوسف کے اندر اجنبی دوڑا
کہا یہ حال دیکھ اک خائف و لاچار انساں کا
لٹکتی تیغ دو دم جس کے سر پر ہے ہر اک لمحا
وہ آیا ہے سہارا ڈھونڈتا اے نیک دل تیرا
نہیں ملتی جگہ کوئی چھپا لینے کو سر اپنا
کہا یوسف نے خیمہ گرچہ میرا ہے، مگر پھر بھی
وہی اس کا ہے مالک اور وہی مختار اور والی
بنایا جس نے روز و شب پُر شوکت و عالی
نہ لوٹایا کسی کو اپنے بابِ فیض سے خالی
چلو اندر، رہو سکھ سے، تنا ول ہو با آزادی
اٹھاؤ مثل میرے نعمتوں سے سلف تم اس کی

تواضع دیر تک مہماں کی شب میں رہی جاری
جگایا اِس کو تڑکے اور دی دینار کی تھیلی
دیا بھر سواری اک صبا رفتار گھوڑا بھی
کہا ادجھل ہو نظروں سے فضائے ساماں کی
دیا جل کے دیئے سے جس طرح ہوتا ہے نورافشاں
شرافت بھی شرافت کو ہے چمکاتی اسی عنواں
دل عاصی کہ یوسف کی شرافت کا ملا فیضاں
کہ سرکش نفس پر آیا تھا غالب جذبۂ ایماں
جبیں یوسف کے قدموں پہ رکھی بادیدۂ گریاں
کہا ہوں گا جدا میں چھوڑ کر تجھ کو نہ یوں حیراں
چُکا دوں گا جو اتنا تو نے مجھ پہ ہے کیا احساں
تیرے بیٹے کا قاتل میں ہوں ابراہیم خستہ جاں
کہا یوسف نے لے چند یہ دینار اور درہم
اِدھر کا رُخ نہ کرنا، منزل نہ کھوٹی کر مرے ہمدم
خیالِ غم ستائے گا نہ اب تڑپوں گا میں پیہم
مرے نورِ نظر لختِ جگر، دارا حشم، اعظم

قلق میرٹھی

بیانِ ہندوستان

وہ درفشاں زمیں ہے خطۂ ہند
جس میں دریائے گنگ ہے اور سندھ

گنگ ہی ہندوؤں کا تیر تھگاہ
بحر شرقی میں سندھ کو ہے راہ

ہند میں وہ عجیب کانیں ہیں
جن کی قدر اہل دید جانیں ہیں

حیرت افزا مناظر دل کش
تازہ سیراب و خوب و خرم و خوش

تاڑ ہیں جیسے ولوسر بہ فلک
خوش نما کے لئے جڑ سے پتوں تک

پر طوطی سے بالوا باغات
بن میں بوزنہائے خوش حرکات

جھاڑیوں میں ہیں شیر مردم خوار
اور نیستاں میں افعی سہ دار

بھاگے پھرتے ہیں خوف سے چیتل
چیتے از بہر صید ہیں بیکل

جھیل اور جنگل قدیم اور ان میں عجیب
سرد آرام گاہ ہائے حبیب
گیسنڈے توڑتے ہیں شاخیں چلاتی
اونچے پیڑوں کو چرتے ہیں ہاتھی
ہیں دو موسم عجیب گرم اور تر
حکمراں اس وسیع میداں پر
کبھی گرمی سے یہ جلاتا ہے
کبھی طوفان میں وہ ڈباتا ہے
گلہ گلہ وحوش پر تب وتاب
بن سے کرکے گریز جانب آب
سرد کرتے ہیں مضطرب شریان
جب کہیں ہوتے ہیں درست اوسان
ہوتا ہے دل کی جب تپش کا وفور
ہو کے بیہوش شاخ پر سے طیور
گرتے ہیں مردہ وار بر سر خاک
رہتا ہے شعلہ خیز جن پر خاک
ٹوٹ پڑتا ہے ناگہاں طوفاں
ہوتے ہیں ایک ساحل و عماں
اور نکلتے ہیں اس کے اندر سے
جو ذخیرے زمیں کے پیٹ میں تھے

منور لکھنوی

تجربہ

عمر انساں کی زمانے میں ہے سراب
تجربہ کا ہے وجود اس میں برنگ محراب
کبھی اس پار جو محراب کے پڑتی ہے نظر
دیکھتا ہوں میں وہاں ایک جہاں نایاب
یہ وہ دنیا ہے نہیں جس کی خبر بھی مجھ کو
اس کی وسعت کا ہے دشوار شمار اور حساب
یہ وہ عالم ہے کبھی خاک نہ چھانی جس کی
آج تک جس کے سفر کا کبھی دیکھا نہیں خواب
جس قدر اس کے سفر کو مرے بڑھتے ہیں قدم
ناامیدی مجھے کر دیتی ہے آگر آب آب
بیکراں ہے صفتِ بحر منوّر یہ جہاں
تجربہ ہے مرا اس بحر میں یک قطرۂ آب
ساری دنیا کا نہیں تجربہ اب تک مجھ کو
ایک مدت سے ہوں گو بحر سفر پا بہ رکاب

محمد امیر

نظارے

دیکھو نسیمِ گلشن کیا گل کھلا رہی ہے
پیڑوں کی ننھی ننھی ڈالیں ہلا رہی ہے
مرغانِ خوبصورت خوشیوں میں گا رہے ہیں
قلب فسردہ میں بھی اک رنگ لا رہے ہیں
پربت ادھر کھڑے ہیں کس شان و تمکنت سے
ہنستے ادھر پڑے ہیں سرسبز کھیت سارے

گھر سے بچھڑ کے اپنے شاید ندی ہے جاتی
رنج و بلا کی ماری کیا جانے کیا ہے گاتی
پھیلا کے اپنے بازو تیزی سے جا رہی ہے
کیا جانے پیار سے وہ کس کو بلا رہی ہے

بادل ادھر تماشہ دلچسپ کر رہے ہیں
پردہ میں آسماں کے سو رنگ بھر رہے ہیں
رنگوں کا سر پہ گویا اک جال تن گیا ہے
جنگل کا پتّا پتّا نظّارہ بن گیا ہے
منظر ہیں کیا سہانے کیسی یہ رنگتیں ہیں
چھائی ہے کیا خموشی کیسی یہ وسعتیں ہیں
کچھ سوجھتا نہیں ہے کیا کہہ رہی ہے قدرت
بے رنگ محفل میری ہوں میں بھی محو حیرت
گہرے ہیں یہ نظارے ان کو سمجھائیں کیوں کر
چھوٹے سے دل میں اپنے یہ سب سمائیں کیوں کر
یہ آسماں کھلا ہے اور ہے کھلی یہ دھرتی
رہ رہ کے من میں میرے کیا گدگدی ہے کرتی

سو رنگ سو ادا سے جلوہ دکھانے والے
بھٹکے ہوؤں کو اپنا رستہ بتانے والے
تو نے ہمیں دکھائے یوں تو بہت ہیں جلوے
پر یہ نہیں بتایا کس کے ہیں یہ نظارے
ہاتھوں بغیر کھینچی عالم کی شکل صورت
یونہی سدا بدلتا رہتا ہے روپ رنگت
پردوں کو اب اٹھا کر سچی جھلک دکھا دے
اور شانتی کی گنگا دل میں مرے بہا دے

منور لکھنوی

توبہ

تھا ارادہ یہ کہ میں چھپ کر کروں کوئی گناہ
وہ جگہ ڈھونڈی جہاں میرے سوا کوئی نہ تھا
گوشے گوشے میں نہایت غور سے ڈالی نگاہ
جس طرف دیکھا وہاں میرے سوا کوئی نہ تھا

پھر یہ دل میں خود بخود پیدا ہوا فوراً خیال
حاضر کل ہے خدا موجود ہو شاید کہیں
لیکن اس کا دیکھنا بھی تھا مجھے امر محال
اور مجھ کو اس کی ہستی کا نہ کچھ آیا یقین
دفعتہً ڈالی جو میں نے اپنی ہستی پر نظر
خود میں اپنے سامنے آمادۂ تعفیر تھا
چشم باطن کھول کر جب کی نظر پھر روح پر
مجھ پہ طاری یک بیک سکتہ کا عالم ہو گیا

میرا منشاء اس جگہ سے نہاں ہو کوئی جہاں
غور سے دیکھا تو میں خود ہی وہاں موجود تھا
اور تھے زلف شہادت سقف و دیوار مکاں
تھی زمیں نیچے تو سر پر آسماں موجود تھا

اس ارادہ سے میں باز آ کر بہ دل تائب ہوا
التجا کی قادر مطلق سے بخشش کے لیے
عمر بھر لایا نہ لب پر نام پھر تقصیر کا
لکھ دیے اشعار یہ تہذیب دانش کے لیے

سعید الدین خاں سعید

سُلطان محمود

ایک دن تھا تخت پر جلوہ فگن
نکلا وہاں فریاد لے کر کوئی بار رنج و محن
جب عرض بیگی نے ادب ملحوظ رکھنے کو کہا
دھکا لگا اس کی خودی کو اور وہ جھلا گیا
اور چیخ کر بولا کہ "حق" ہے رنج و غم کرنا میرا
شاہ سے کسی صورت ملوں گا میں اس شب برملا
محمود نے سن کر کہا کہ "غم" شے ہے ایک توقیر کی
شاہ جیسے جانے شاہ کا حق ہوں معترف میں اسکا بھی
کہنا ہے کیا تجھ کو؟ کیا بد ذات اک آتا ہے گھر
دیتا ہے ہم سب کو اذیت پر اذیت بے خطر
افسر یہ کوئی ہے تیرا لعنت مجسم بد شیم
کرتا مکاں و ا ھز پر قبضہ با جور و ستم

پوچھا وہ اب موجود ہے، بولا "نہیں"
وہ جا چکا جس وقت اپنے گھر سے میں ترے محل کو چلا
اس نے اڑایا مضحکہ کھائی جو میں نے یہ قسم
شاہ کو لے آتا ہوں تا کر دے وہ سر تیرا قلم
بولا یا عسرت نے بنایا مجھ کو فرقت نے سڑی
فریاد اس حالت میں لے آیا ہوں میں خدمت میں تری
انصاف کمزوروں کا کرنے کے لئے دی ہے شہی
حکم دیتا ہے تجھے بادشاہ اللہ بھی
ملکان نے دی غور دیدہ کو تسلی اور کہا
بے فکر اور بے خوف لے تو اپنے گھر کا راستہ
چیزیں پہونچ جائیں گی کھانے کی ضرورت کی تجھے
آجائے پھر ملعون وہ دینا خبر اس کی مجھے
گذرے نہ تھے دن تین کہ دوبارہ آیا مدعی
تھا خوف رخ پر بال الجھے کانپتی آواز تھی
بولا "شاہ" اب آگیا ہے گھر پہ وہ ظالم الجھے شقی
یہ سن کر شاہ نے کچھ لئے ہمراہ مسلح خدمتی
اور ساتھ اس مظلوم کے پہونچے وہ ایسی جا جہاں
بیٹھی ہوئی تھی ایک ضعیفہ غم زدہ ماتم کناں

خائف پریشاں، بےکس، مجبور اور دہشت زدہ

اور کہتے جاتی تھی جو بے تابانہ اور بے ساختہ

تب مدعی سے شاہ بولا جا زنانہ میں ابھی

بتی بجھا کر عورتوں کا تخلیہ کردے سبھی

پیچھا کرے ان کا شرمیں ہو گئے وہ شیطان جب

ہم بھی ابھی بتائیں گے کرتا ہے کیا انسان جب

جیسے ہی وہ اندر گیا آواز آئی چیخ کی،

تاریک کمرہ ہو گیا اور میز دھم سے گر پڑی

بھگدڑ مچی پیچھے وہ دوڑا عورتوں کے جھومتے

دی گالیاں بدبخت نے بیباک ہو کر چیختے

پھل پا گیا کرتوت کا ظالم قلم تھا ان کا سر

ٹکڑے اڑاتے شاہ نے تھی لاش ظالم خون سے تر

لاشے پہ جھک کر چہرہ دیکھا غور سے مقتول کا

دوگانہ شکرانہ اس نے پھر کیا فوراً ادا

بالکل مجوب خامشی سے سب کھڑے حیراں رہے

ماہی و ملک، مرغ و کباب ارشاد شاہ پر آ گئے

حیرت زدہ، مجبور، اشک فشاں و مرد باصفا

سلطان کے قدموں پر دعائے خیر دیتا گر پڑا

کی التجا اس نے کہ اے شہ کیا ملا ہے اس کا پھل
کیوں شمع گل کرنے کہا تھا آپ نے پہلے پہل
سلطان نے اخلاق نرمی سے جواب اس کو دیا
فریاد لے کر پاس میرے جب تیرا آنا ہوا
اندیشہ جب ہی سے تھا برا بر یہی مجھ کو لگا
نکلے نا پاجی پن یہ میرے افسر و فرزند کا
غالب نہ ہو جائے کہیں اس دم محبت باپ کی
حرف آ جائے عدل پر گر میں دکھاؤں بزدلی
بتی بجھادی تا نہ دیکھوں چہرہ اس بدکار کا
قتل اور ہی کا جب ہوا نکلا شبہ بیجا میرا
شکرانہ اس مختار کل کا جھٹ گیا میں نے ادا
دکھ اور ڈر کی وجہ کام اس کا یہ میں نے کر دیا
کھایا نہ تھا اس دن سے ڈالی ماحضر نے تن میں جان
چھینا تھا تو نے صبر و اطمینان قلب ناتوان

منوّر لکھنوی

منظرِ فنا

انسان آنکھ کھول کے اپنا مآل دیکھ
یہ کیا ہوا ہے پیکرِ خاکی کا حال دیکھ
دیکھ اور خوب دیکھ کہ عبرت کی جا ہے یہ
ہے اک مقامِ خوف کا ہیبت کی جا ہے یہ
کر غور دل میں اور یہاں کے مزار گن
کتنے ہیں اس میں دفن بھلا تاجدار گن
کتنے یہاں غیور مکیں مقبروں کے ہیں
انبار سے دبے ہوئے اب پتھروں کے ہیں
یہ تاجدار وہ ہیں کہ تھے فخرِ روزگار
حاصل تھا جن کو ظلِّ الٰہی کا افتخار
قبضے میں جن کے سیکڑوں ہی شہریار تھے
جو تاجدارِ مملکتِ روزگار تھے
لیکن وہ ان کی شان و شوکت نہیں رہی
اب ہاتھ تک ہلانے کی طاقت نہیں رہی

زیر مزار واعظ منبر نشیں ہیں یہ
عبرت دہ مآل ہمیں بالیقیں ہیں یہ
یعنی جو حکمراں ہیں انھیں بھی بقا نہیں
یہ اوج اعتبار کے قابل ذرا نہیں
ہے ایک کشت زار یہاں کی زمیں نہیں
روح حیات جس میں نمایاں کہیں نہیں
جو اس زمین میں دفن ہیں اعلیٰ نسب ہیں وہ
کم دُرِ شہوار سے رتبہ میں کب ہیں وہ
جس دن سے بھی جہاں میں نزول بشر ہوا
اس کشت پائمال سے آتی ہے یہ صدا
جن کی سرشت مثل ملائک تھی آئینہ
ان کا ہوا ہے جامۂ انساں میں خاتمہ
عالم یہ اک مٹی ہوئی شاہنشہی کا ہے
اک خواب جس میں نام و نشاں زندگی کا ہے
قسمت نے ان کو پہلے تو مردہ بنا دیا
پھر خاک میں ملا دیا اتنا مٹا دیا
عبرت دہ جہاں کوئی اس سے سوا نہیں
شاہوں کا مقبرہ ہے کسی اور کا نہیں

پھول اور پیام

جا اور گلِ گلاب تو کارِ ثواب کو
میرا پیام دے مری عصمت مآب کو
کیوں مفت کھو رہی ہے وہ یوں وقتِ مغتنم
کیا جانتی نہیں تو کہ فرصت بہت ہے کم
اس وقت آتشیں وہ رخسار پھول سے
منہ سے بھی چھوٹے ہیں دمِ گفتار پھول سے
گر وہ ہے شمعِ حسن تو پروانہ میں بھی ہوں
ہے وہ پری جمال تو دیوانہ میں بھی ہوں
لازم ہے شکرِ نعمتِ پروردگار اسے
واجب ہے فکرِ گردشِ لیل و نہار اسے
کیا مال ہے یہ حسن اگر قدرداں نہ ہو
مجنوں نہ ہو تو لیلیٰ کی بھی داستاں نہ ہو
اے گل تو ہی بتا کہ تجھے گر بجائے باغ
بہر نشیمن آج ملا ہوتا کوئی زاغ

خوبی کو تیری دیکھنے والا بھی تھا کوئی
سو جاں سے تیرا والہ و شیدا بھی تھا کوئی
ایسی ہی وہ مری سمن اندام نازنیں
جنگل میں اور کوہ و دشت میں ہوتی اگر کہیں
اہل نظر کی جس جگہ ہوتی نہ دسترس
اور ایک ساں ہی ہوتے جہاں ناکس اور کس
واں جنس حسن ہوتی خریدار میں بڑی
اور دل ربا وہ ہوتی طلب گار میں پڑی
پیغام مرا دے کے اسے اے گل گلاب
مرجھانا بے دریغ وہیں کھا کے پیچ و تاب
شاید کہ تیرے مرنے سے ہشیار ہو گے وہ
انجام حسن دیکھ کے بیدار ہو گئے وہ
جانے کہ کوئی گل کا سا رنگیں قبا بھی ہو
شیریں سے بڑھ کے گو کوئی شیریں ادا بھی ہو
قبضے میں اس کے حسن کا حصہ ہے چند روز
دنیا میں حسن و عشق کا قصہ ہے چند روز
جو فائدہ اٹھانا ہو اس سے اٹھائے جلد
دل میں سما چکی ہے نظر میں سمائے جلد

ہری جہنۃ -

ایک برفیلی شام

جس کے جنگل ہیں جانتا ہوں اُسے
اس کا گھر وہ وہاں ہے گاؤں میں
پر مجھے وہ نہ دیکھ پائے یہاں
برف گرتی ہے جنگلوں میں جہاں
سال کی سب سے گہری شام ڈھلے
منجمد جھیل ٹھٹھیوں کے تلے
ٹھہرنا یوں جہاں نہ گھر ہو قریب
گھوڑا میرا سمجھ رہا ہے عجیب
گھنٹیاں ساز کی بجاتا ہے
گویا کہتا ہے کیا تماشا ہے

ایک آواز اور آتی ہے
برف میں باد سرسراتی ہے
گہرے جنگل حسیں سہانے ہیں
میں نے وعدے مگر نبھانے ہیں
میلوں چلنے کے بعد سونا ہے
میلوں چلنے کے بعد سونا ہے

سازِ مغرب کے چھ حصّوں میں شریک کئے گئے

۵۸۶ منظوم ترجموں کی فہرست

اس فہرست میں شاعروں کے نام حروفِ تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیئے گئے ہیں اور نظموں کے عنوان کے مقابل سازِ مغرب کے حصہ اور صفحہ نمبر کو اعداد میں درج کیا گیا ہے۔

الف

ز

س

ص

ض

Saaz-e-Magrib

Vol. VI

[م۔ جہاں]

CONTENTS

LIVES OF POOR MEN

Lives of poormen oft remind us

Honest toil don't stand a chance.

The more we work we leave behind us

Bigger patches on our pants.

On our pants once new and glassy

Now are patches of different hue.

All because subscribers linger

And won't pay up what is due.

Then let all be up and doing

Send in your mite be it so small

Or when the snows of winter strike us

We shall have no pants at all.

THE EMPIRE OF ISLAM

WHEN sword and sceptre, crown and throne were cast
A shapeless wreck round Time's devouring shore,
God's will could yet remould the shattered past,
Rebuild Life's throne though empires were no more,
Their conquering might sunk in oblivion,
Their ancient glories sepultured in loam,
Egypt, Assyria, Media, Babylon
Were names, and fading memories Greece and Rome

Man's will triumphant bade the future rise
From out the past, and hope and faith, reborn,
Strove for the empire of the earth and skies,
And changed the night of ages into morn !
A prophet's will, supreme O're space and time,
Did gain unbounded realms by faith sublime.

Sir Nizamath Jung

THE AWAKENING OF THE SOUL

THE CALL :

O soft is the music that I send to thee
And sweet the call is of this boundless sea,
Awake, O soul, from long long sleep,
And rise from the abysmal deep;
O, break the earthly bonds that here thee bind,
And leave this little, mortal world behind.

I made the heaven's floating mass of blue
And tinted it with many a tender hue;
I am the storm-wind's whirling might,
I am the soft moon's peaceful light;
In pleading stars I glitter from the sky,
On earth the fragrance of the flowers am I.

O, I am He, who made the gentle breeze,
That stirs among the slender graceful trees;
I made the whirling fire-ball's light,
I made the majesty of night;
I made the wondrous tear filled clouds above;
And yet, 'tis I am yeanring for thy love.

I sent some joy, some pain, some love to thee,
So that on earth thou may'st remember me;
I stood revealed in many things;
And now I give thee silver wings.
Arise to me, for I will give thee rest
And fold thee to my tender loving breast.

THE ANSWER

From out the dreary sea of dark,
What sound is this I hear,
What light is that whose wondrous spark,
Is drawing near, is drawing near,

A soft and silver melody,
Comes whispering to my ear,
The sobbing music calls to me,
What binds me here, what binds me here?

A feeling sweet and infinite,
Is in the music's flow,
(My dead numb heart is feeling it,
O let me go ! O let me go !)

O music full of life, of death !
In thee's Eternity;
A fever holds my gasping breath,
Who calls to me, who calls to me ?

'Tis Thou my Lord art calling me,
To rise I try in vain,
How shall I come, my love, to thee
I'm bound by pain, I'm bound by pain.

I saw Thy glitter in each star,
Thy beauty on the sea,
And from the sunset flaming far
Thou calledest me ! Thou calledest me !

Oh in the turmoil where I bled,
My torn heart cried for Thee,
My love for Thee was never dead,
I sighed for Thee ! I sighed for Thee !

Yet Lord, I must not see Thy light,
Though heart with pain is sore,
For soiled by sin and lost in night,
I am not pure, I am not pure !

Nay I am wrong, for Thou art God,
The pain I did endure
With all my love for Thee, dear Lord,
Hath made me pure, Hath made me pure !

I leave the little twinge and ache
Of little worlds behind,
And all the little bonds I break
That here me bind, that here me bind !

I rise in wondrous ecstasy,
My test on earth is done,
And now Immortal, pure and free
My Love, I come ! my Love I come !

Mumtaz Jahan

ALL THAT'S PAST

Very old are the woods ;
And the buds that break
Out of the briers' boughs,
When March winds wake,
So old with their beauty are-
Oh, no man knows
Through what wild centuries
Roves back the rose.

Very old are the brooks ;
And the rills that rise.
Where snow sleeps cold beneath
The azure skies
Sing such a history
Of course & gone,
Their every drop is as wise
As Solomon

Very old are the men ;
Our dreams are tales
Told in Dim Eden
By Eves' nightingales ;
We wake & whisper awile
But, the day gone by,
Silience & steep like fields
Of Amaranin lie.

Walter De la Mare

A PAYER FOR THE KING'S REIGN

O God the Ruler over Earth and Sea,
Grant us Thy guidance in the reign to be;

Grant that our King may make this ancient land
A realm of brothers working mind and hand

To make the life of man a fairer thing;
God grant this living glory to the King,

Grant, to our Queen, the strength that lifts and shares
The daily burden that a monarch bears:

Grant, to them both, Thy holy help to give
The hopeless, hope, the workless, means to live;

The light to see, and skill to make us see,
Where ways are bad, What better ways may be;

And grace to give to working minds the zest
To reach excelling things beyond their best:

Grant to them peace, and Thy diviner peace,
The joy of making human wars to cease:

Make wise the councils of the men who sway
The Britain here, The Britains far away:

And grant us all that every rightness willed
In this beginning reign May be fulfilled.

THE ARAB CHAUNT

ARABIA lay entombed in night ;
A beam from Heaven revealed
Islam, a sword of living light
Islam, the spirit's shield.

A prophet in our midst arose,
Whose voice to God appealed
" Allah ! Thy grace high gifts bestows
Let Islam be our shield ! "

And then beyond the desert sand
The wide world was our field,
The sword of Faith was in our hand,
with Islam for our shield.

And when we marched across the world,
Our power of faith to wield,
Islam the flag of Peace unfurled
High o'er its blazoned shield.

We dared - and rose to heights unknown
Of power which ne'er would yield
Save to the will of God alone,
While Islam was our shield,

We fought for Faith in love not hate,
And Faith this vIsion revealed ;
Mankind - one nation good and great,
With Islam for its shield,

Our pact of love and Brotherhood
With faith and honour sealed,
True Champions of Right we stood,
With Islam for our shield.

Years rolled, Time saw our glories fade;
We sank 'neath grace replealed.
Our power with righteous will decayed
Though Islam was our shield.

We sank, and sank - to rise again
Till Fate to us shall yield
The skill to wipe each rusty stain
Off Islam 's dented shield !

To God alone all glory, power ;
To him alone we've kneeled.
"Tis ours to scorn misfortun'es wrong
While Islam is our shield.

Sir Nizamat Jung

CALL OF MEDINA

FROM Medina's dust arising,
Faith sent forth a beacon - blaze,
New worlds as his own reveling
To the Muslim's eager gaze

Earthed in fire-shrines, though in cinders
Lay the fire that wont to be,
On th' horizon rose a planet-
Persia's happier destiny.

From Iraq's and Syria's vision
Superstition's veil was raised ;
Earth then owned a new-found grandeur,
Skies with brighter glory blazed.

Power supreme was God Almighty's
He the Lord of earth and sky
He the Master as Creator
Of men, brutes and genil.

Prophets were His servants-never
Did they right to rule demand;
Messengers - their duty, guidance
In obedience to command.

What of Khusroes, what of Caesars ?
All were doomed to disappear
Such was Fate's design and mandate
Given to the rolling year.

He who stood above all monarchs -
Monarchs of imperial sway -
In blest poverty rejoicing
(Humble pride, and no dismay) -

Never carved his heart adornment,
Never longed for gem nor gold -
Heart that was of Truth the mirror,
Heart that did Heaven's light infold.

Morn till eve in arduous labours,
All the night in worship spent,
Every fast to God a tribute
Of a grateful heart's contents.

Warder of the rising faith and
Guardian of the faithful band;
Righteous, striving ; dauntless, suffering ;
Man of action, shield in hand.

Such the pious strength and valour
That subdued the foamen's race ;
And his conquest and its message-
Only amnesty, and grace !

Of this crownless kind the Khalifa
Ruling o'er a wide domain,
Ruled O'ver Syria, ruled O'er Persia,
Egypt, Africa and Spain.

Not from wealth, and not from grandeur,
But from might of faith alone.
Islam's right to rule the world - and
Such a right did Islam own.

Islam's centre is Medina,
Hallowed seat of sovereign power ;
Treasure - house of glor.ous memories
And of Faith's clestial dower.

Faith Is resplendent rays are vibrant
Still upon its holy ground,
Though from hidden ills some shadows
Inaussicious, fall around.

What though power with wealth has faded
Will men let their courage die ?
Is there no Muslim who in misery
Still can hold his head full high ?

Muslmi's sloth was Muslim's downfall,
Oh ! the glory that has been
Fills with awe and breathes a sadness
O'er this City's desolate scene.

Muslim haarts ! Be not despondent ;
Ye shall see i.s glories rise.
Ruins yet shall wear the semblance
Ot the bowers of Paradise.

Here, though hid in dust and squalour,
Light from God may still be won ;
Every mote and atom floating
Here reflects the shining sun !

Rise, O rise from lethal slumber,
On Medina fix your eyes !
Heart and home of Muslim's being,
Here the hope of Muslims lies.

Never will our hearts as Muslims
Never of God's aid despair,
Heart of faith is God's own stronghold;
What lack we when He is there?

Muslims of the world! Your duty -
Whether rich or humble you -
Is to aid Medina's people,
If your vows of Faith be true,

Faith is neither whim nor fancy;
Nor of empty words a store.
Work like him, the mighty worker
Who did build our world before.

By mere words and vain professions
Can ye ever hope to claim
Status as the Prophet's People,
Win the Muslim's honoured name?

Yield your heart, your wealth, your service -
Yield them all to serve His cause
Win the guerdone of well-doing;
God's approval, men's applause;

Grant O God! to every Muslim,
Grant the will to righteous deed,
Muslims by their deeds confirming
Their profession of the creed.

Sir Nizamat Jung.

THE WAY TO MADINA

ALOOF and grim the mountains stand
Where not a plant will grow;
Where silent heaves a sea of sand,
Beneath the sun's fierce glow.

A pilgrim bends, with labouring breath,
O'er scorching sand and stones
Marked by that monument of death—
A camel's bleaching bone.

He gazes on the mountain heights
And on the desert bare,—
If life presents no soft delights,
Death has no terrrors there.

How leisurely that caravan
Of camels passes by !
How, lurching o'er the gravelly span,
The creaking motors fly !

He stands at gaze withe longing eyes,
Uplifts an eager hand......
And as the last one mocKing flies
He sinks upon the sand.

Then creeps to an acacia—tree
With sparse but friendly shade,
And 'neath that thorny canopy
His listless form is laid.

To his own land his fancy flies
To roads and roadside trees,
Where, close at hand, the well supplies
Its bounty, and the breeze.

Through rustling leeves will softly come
To cool his brow to rest,
And birds will chirp and insects hum
To soothe his lonely breast.

But here-his heart well understands
How death can fears defy.
Here life and death are joining hands;
'Tis one to live ar die !

On, on with striving soul untried,
With tottering steps. and slow;
Fainting, but with faith's frenzy fired,
Still onward he must go......

Onward, beyond those hills, that plain
Where yonder vision flies...
Where-could he yonder heights but galn—
The Chosen City lies.

Chosen of him whose presence shot
Through darkness living light,
Of him who unto mankind brought
The message of its might.

Faith gives him strength and quicknes love,
And hope soon quells despair.
The Master becknons from above.
So onward he must fare.

New life is in his limbs, he treads
With firmer step the sand
That still immeasureably spreads
Betwixt him and the land.

He fain would reach. Oh, for that hour
When near and yet more near,
Those symbols of mysterious power,
Medina's hills appear !

But now the bitter, bitter strife,
The endless, endless way.........
"Twixt life and death, 'twixt death and life
Unending seems the day.

Yet onward, onward still
He drags his weary weight,—
A martyr of unbending will,
A votary of fate.

At last, at last he gains the height
From whence his eye can roam
To scenes where, conscious of its might,
Islam first found a home.

There, cradled in a happy vale,
Med na's relics lie—
He gasps, as though his heart would fail—
The Green Dome strikes his eye!

That trembling, rapturous glance, the first
So stirs some passion deep,
Had he a hundrd hearts, they'd burst;
A hundred eyes—they'd weep !

Man knows not why so throbs the heart
And bids the eye o'erflow;
No power that secret will impart.
And none shall ever know.

He gazes on the rocky plain
That overlooks the town.
Its verge his weary feet must gain
Before the sun goes down.

"Ah! there, where yon white turrets shine,
At eventide to rest;
And at our Master's holy shrine
To end my life-long quest !

He stands where light from heaven is shed,
His Maker to adore—
He finds bis quest—He bows his head.........
And sinks to rise no more !

Nizamat Jung

WHERE THE MIND IS WITHOUT FEAR

Where the mind is without fear and the head Is
held high;

Where knowledge is free;

Where the world has not been broken up

Into fragments by narrow domestic walls;

Where words come out from the depth of truth,

Where liveless striving stretches its arms towards
perfection;

Where the clear Stream of reason has not lost its
way i

Into the dreary desert sound of death habit;

Where the mind is led forwards by Thee

Into ever-windering thought and actian.........

Into that heaven of freedom, my Father, lrt my
country awake !

Rabindranath Tagore.

THE SPIRIT OF DELIGHT

(Last - Stanza)

I love love, though he has wings

And like light can flee

But before all things

Spirit I love Thee

Thou art love and life O come

Make once more my heart thy home.

P. B. Shelley.

AT THE HAJ

KINGDOMS and Empires may decline,
Of pomp and power and splendour reft;
Here is no change—the spark divine
Still in these hills and sands is left.

May it not leap once more to flame
And dart its beams across the world
Lead Right once more her rule to claim,
See Wrong once more to ruin hurled ?

Long year through varied scenes have rolled,
But left untouched the desert wild,
And left untamed the Arab bold,
The desert's lord the desert's child.

The might of Arab heart and hand
Still breathes, of outward glory shorn,
The faith that glows in burning sand,
Ths freedom of the desert born.

The Arab scorns our world of pride;
He built his—and might build again.
But he must seek what shall abide;
And what he lost may be his gain !

Untaught, unused to smile on wrong,
Fearless, entrenched in faifh—
This made him, and will make him strong,
Un conquered, free—in life, in death.

Strong, patient, to God's will resigned,
His faith will direst ills outlast ;
For deep within his soul he'll find
The living message of the past.

Faith moves him on to find the way
By God ordained. by Prophets found,
And hope renews the promised day
Whene'er he treads this holy ground.

Sir Nizamat Jung.

AFTER THE CONQUEST OF PERSIA

LOUD throbs Medina's heart with prayer and praise;
Her conquering arms from Persia's fields return ;
All eyes upon the heroes fix, their gaze,
While anxious hearts for missing faces yearn.

Out side the Prophet's mosque the elders stand
Around their Chief to welcome and to greet
The noble leaders and the valiant band
Who come to lay their trophies at his feet.

And he, the Khalif marks the joyous stir
Of grateful hearts rejoicing in their gain ;
He, throneless king and pompless conqueror
Of Syria's lands and Persia's wide domain !

A tall stern figure, somewhat past his prime,
An iron will within an iron frame.
Ordained to stamp Faith's edicts upon time ;
Omar, a man of might, a mighty name.

His were the words "Sa'd Waqqas ! Be it thine
O'er godless realms God's levin—bolt to fling,
To purge with purer flame the Magian's shrine,
To tame the high-born pride of Persia's King !!

Sa'd heard—and went and conquered ;quenched the star
That long had shone upon the Persian race.
Soldier of fate, whose victory near and far
Did spread like light the beams of dawning grace.

And now behold there lie upon the ground
Tropbies of nameless price from Persia won ;
Bright jewels all in heaps, before, around,
That once adorned the votaries of the Sun.

The Khalif looks, then turns away his eyes;
Another vision haunting memory brings ;
He hears the voice that raught him to despise.
The glittering gauds that grace the pomp of kings.

What thoughts are his upon this glorious day ;
More glorious than an Alexander's dream !
Deep thoughts, and sad thoughts that dismay
The soul that takes life's gifts for what they seem.

"Lo ! Persia's kingdom lies a crumpled scroll,
As he foretold who sleeps in yonder grave.
God's peace and blessings on the Prophe't soul !
Glory is God's not mine, His humble slave.

All, all upon this earth shall pass away ;
Kingdoms and kings, wealth, power, glory fame;
The weak heart's snare, the playthings of a day ;
The weak soul's lure, the echoes of a name.

Thy power abides, for Thine the hand alone
Which holds the kingom of the earth and skies.
Lord of all worlds ! Creation is Thy throne,
And all Eternity below Thee lies.

Such are his thoughts; he turns the crowd to scan
" Say, who hath seen the Persian on his throne,
Decked in his jewelled trappings? Dress you man
E'en like the King, that to us may be known

Vain Yezdgurd's form-poor phantom of a king !
An Arab soldier wears the diadem
The monarch wore, his collar and his ring,
His shoes of gold, his robe with jewelled hem.

" For these he lost his life......when he had lost
His kingdom......and his warriors, through his pride.
He had the choice and chose at mortal cost
That which hath fled, not that which shall abide !"

Sir Nizamat Jung

THE MIRACLES OF ISLAM

A FAITH in one lone bosom stirred,
A voice by one lone ear was heard
And all Creation and its mystery
Lay like an open book lit by one word
'Read' and the heart became an eye to see
God's self in His Creation. All was light—
The Unlty of God, His mery and His might.

A savage race, a savage clime;
He but a man who, past his prime,
Unread before, was made that Word to read,
The Word that burned into the heart of Time
The simplest, purest, and the noblest creed.
That living Word, a miracle, went forth
To conquer realms and hearts to East and
West and North!

By it the Arab righteous made,
Brave, and of none but God afraid,
Child of the desert, broke proud Persia's might.
And quenched her sun; her pomp and
glory's shade
Was iike a phantom lost in endless night
A miracle; for soon salvation came
And Persia stood once more upon the of roll of fame.

The dazzled votaries of the Sun
Who lost their creed and kingdom, won
New light from Truth, and learned to bow before
The Unseen, Increate, Enternal, One ;
His goodness, might and mercy to adore,
Whose light unchanged their changeful
beams hath given
Unto the sun, and moon, and all the stars of
heaven

And Syria too, the Eastern home
Of the decaying pomp of Rome,
Beheld a miracle—the lightning glance
Of Arab swords—and like a tottering dome
Fell at the touch of Bedouin sword and lance,
Nor Rome's dread name nor all her deed's renown
Could stem the conquering tide that ruched
from town to town.

Later, tne Sphinx was forced to read
The riddle of the new—old creed
Which Moses thundered once in Pharaoh's ear ;
And Memphis hailed the miracle at her need
To rise from darkness into daylight clear ;
And Alexander's city owned the sway
Of Yethreb in whose heart a might empire lay !

Then ruined Carthage. great in fame,
Contemner of the Roman name,
Warder of Africa's burning heart restored
To Islam's keeping when its heroes came,
Her faded laurels and her broken sword.
But onward, westward did the conquerors ride,
Where tow'rd the setting sun the Atlantic
flings his tide.

Sir Nizamat Jung.

ABSENCE

Being your Slave, what would I do but tend
Upon the hours and times of your desire ?
I have no precious time at all to spend
Nor services to do, till you require:

Nor dare I chide the world—without—end hour
Whilst I, my Sovereign, watch the clock for you,
Nor think the bitterness of absence Sour
When you have laid your servant adieu

Nor dare I question with my jealous thought
Where you may be, or your affairs suppose,
But like a Sad Slave, Stay and think of nought
Save where you are, how happy you make those:—

So true a fool is love, that in your will,
Though you do anything, he thinks no ill.

W. Shakespeare.

IF LOVE WERE WHAT THE ROSE IS

If love were what the rose is
And I were like the leaf
our lives would grow together
In sad or singing weather
Blown fields or flowerful closes
Ggreen pleasure or grey grief ;
If love were what the rose is
And I were like the leaf.

If I were what the words are
And love were like the tune
With double,sound and single
Delight our lips would mingle
With kisses glad as birds are
That get sweet rain at moon ;
If I were what the words are
And love more like the tune.

If you were April's lady
And I were lord in May
We would throw with leves for hours
And draw for days with flowers
Till day like night were shady
And night were bright like day ;
If you were April's lady
And I were lord in May.

If you were queen of pleasure
And I were king of pain
We'd hunt down love together
Pluck out his flying feather
And teach his feet a measure
And find his mouth a rein ;
If you were queen of pleasure
And I were king of pain.

SOUL AND BODY

Poor Soul, the centre of my Sinful earch,
(Fool'd by) those rebel powers that thee array,
Why dost thou pine within, and suffer dearth,
Painting thy outward walls so costly gay?

Why so large cost, having so short a lease,
Dost thou upon thy fading mansion spend?
Shall warms, inheritors of this excess,
Eat up thy charge? is this thy body's end?

Then, Soul, live thou upon thy servant's loss,
And let that pine to aggravate thy Store;
Buy, term devine in selling hours of dross;
Within be fed, without be rich no more:-

So shalt thou feed on death, that feeds on men,
And death once dead, there is no more dying then.

W. Shakespeare.

AN ISLAMIC HYMN

Unseen Allseeing Lord of all
Eternal, Uncreate;
Thy will makes worlds arise and fall
Thy thought unknown is Fate.
Creator Thou of Heaven and Earth
Lord of Eternity.
All life from Thee alone has birth
All life returns to Thee.

Thou wast, Thou art, and Thou shall be
As when Thy work began
From Nothing to Infinity
From formless clay to Man.
Atoms of dust, we are made whole
And quickened by Thy breath;
Yea Thou dost breath deathless soul
Into the heart of death.

All seeing and All knowing Thou
Master of morn and night.
O guide us on Thy way even now
From darkness unto light.
Our life on earth is idle sport
A year a month a day,
Thou art our Refuge our Resort
When all shall pass away.

The hidden and the manifest
Alike are known to Thee
All acts all thoughts within man's breast
Of sin or probity.
Thou guidest with master's care
If man but understood
His soul from that which seemeth fair
To Everlasting Good.

We praise Thee Merciful Benign
We praise Thee and obey
Lord of the worlds All life is Thine
And Thine the Judgement Day.
O lead us to the path of Right
Guide us along the way
Of those on whom Thy grace doth light.
And not of those who stray.

IN VOCATION

To The Spirlt of Light

SPIRIT of light, from starry mansions straying,
Whsoe flight is o'over this wotld of voe and scrife,
On, on thy course, to mortal hearts conveying
Gods' meaning of the mystery of life ;

ON, on, thy course, wide-scattering from each pinion
Sparks that shall leave behind a trail of fire
To guide mankind from passion's dire dominion
To purer heavens of the soul's desire;

To cheer them toil-worn, weary and benighted
With Heaven-born hope pure as the Dawn's first ray;
To gladden them in Sorrow's gloom affrighted.
With thy sure promise of Esternal Day;

Oh, sing to them thy song of hope and gladness,
Dispel all sombre shadows from rhe air
Till freed from dismal doubt and fear and sadness,
The hearf of men shall deem the world more fair ;

Bare to the skies in its unsullied brightness
The keen edge of thy spirit-tempered blade.
Held in that hand aloft, whose radiant white ness
The Lord of Light hath His own symbol made;

Give it to those who seek the path of glory
In realms beyond the shadow of the grave,
Above the loud acclaim of song and story,
Who keep life's tenor righteous, bright, and brave.

Oh quell the powers of darkness that surround them
Guileful to lure and eager to destroy
Whose vain, deluding phantoms throng around them
And feign the guise of Wealth and Peace and Joy.

Speed on thy course with outspread wings pursuing
The destined orbit of thy heavenward flight,
Wide o'er the world with bounteous hand bestrewing
The stars of Faith amid the shades of Night

YUSSOUF

A stranger came one night to Yussouf's tent,
Saying, 'Behold one outcast and in dread.
Against. whose life the bow of power is bent,
Who flies, and hath not where to lay his head
I come to thee for shelter and for food.
To Yussouf. callled through all our tribes " The Good,"

'This tent is mine. 'said Yussouf, 'but no more
Than it is God's; come in, and be at peace ;
Freely shalt thou partake of all my store,
As I or His who buildeth over these
Our tents His glorious roof of night and day,
And at whose door none ever yet heard "Nay."

So Yussouf entertaind his guest that night,
And, waking him ere day, said, 'Here is gold;
My swiftest horse is saddled for thy flight;
Depart before the prying day grows bold.'
As one lamp lights another, nor grows less,
So nobleness enkindleth nobleness.

That inward light the stranger's face made grand,
Which shines from all self-conquest. Kneeling low'
He bowed his forehead upon Yussouf's hand,
Sobbing, O Sheik, I cannot leave thee so;
I will repay thee; all this thou hast done
Unto that Ibrahim who slew thy son!

‘Take thrice the gold,’ said Yussouf; ‘for with thee
Into the desert, never to return,
My one black thought shall ride away from me.
First-born, for whom by day and night I yearn,
Balanced and just are all of God’s decrees;
Thou art avenged, my firsr-born, sleep in peace !

J. R. LOWELL

The man amaz'd, all mildness now and tears,
Fell at the Sultan,s feet with many prayers,
And begg'd him to vouchsafe to tell his slave,
The reason first of that command he gave
About the light; then when he saw the face,
Why he knelt down; and lastly how it was
That fare so poor as his detain'd him in the place.

The Sultan said, with much humanity,
'Since first I heard thee come, and heard thy cry,
I could not rid me of a dread that one
By whom such daring villanies were done,
Must be some lord of mine, perhaps a lawless son,

Whoe'er he was, I knew my task, but fear'd
A father's heart, in case the worst appear'd
For this I had the light put out. But when
I saw the face and found a stranger slain.
I knelt and thank'd the sovereign arbiter,
Whose work I had perform'd through pain and fear.
And then I rose and was refreshe'd with food,
The frist time since thou cam'st and marr'd'st my
solitude.'

LEIGH HUNT.

SOLITARY REAPER

Behold her single in the field,
You solitary highland lass!
Reaping & Singing by herself;
Stop here or gently pass!
Alone she cuts & binds the grain,
And sings a meloncholy strain,
Oh! listen ! For the vale profound
I's overflowing with the sound.

No nightingale did ever chant
More welcome notes to weary bands
Of travelling in some shady haunt,
Among Arabian sands;

A voice so thrilling never was heard
In spring time from cuckoo-birds,
Breaking the silence of the sea.
Among the farthest Hebrides.

Will no one tell me what she sings?
Perhaps the plaintive numbers flow
For old unhappy far off things
And batter long ago:
Or is it some more humble lay,
Familia matter of to-day?
Some natural sorrow loss or pain
That has been and may be again?

Whatever the theme, th maiden sang
As if her song could have no ending;
I saw her singing at her work:
And over the sickee bending;
I listened motionlees and still;
And, when I mounted up the hill,
The music in my heart I bore,
Long after it was heard no more.

W. WORDSWORTH